ستمبر 59

رجسٹر ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۲ — عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء	جلد ۵۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

وہ محکم چٹان جس کی بنا پر ایک قوم اپنی ہستی کو دنیا میں قائم رکھ سکتی ہے اور دنیا کی ہر اس رَو کو جو اسے اپنے ساتھ بہا لے جانے کے لیے آگے بڑھے ناکام و نامراد بنا دیتی ہے، اس قوم کی قوتِ ایمانی ہے۔ جس قدر یہ قوت زیادہ ہو گی، اسی قدر اُس قوم کے اندر ہر سیلاب کے مقابلہ کرنے کی استعداد بھی زیادہ ہو گی۔ دنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی ایمان کی حرارت سے خالی ہو۔ تاریخ پر ایک عمومی نگاہ ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قوموں کی ابقا اور ترقی میں اس قوت نے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کسی قوم کی زندگی اس کی قوت ایمانی سے وابستہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہو گا۔ یہ قوت نہ صرف ایک فرد کے اندر سعی و جہد کا ولولہ پیدا کرتی ہے بلکہ اُس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں ایک راہ پر لگاتی ہے۔ پھر اسی کی مدد سے افراد کے مابین مودت اور اخوت کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور اس طرح معاشرتی زندگی کی داغ بیل پڑتی ہے، اسی سے اجتماعی شعور کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اور مختلف قومیں اور ملتیں جنم لیتی ہیں۔ اسی کی بدولت افراد اور اقوام میں عمل کی خواہش اور ترقی کی تڑپ پرورش پاتی ہے۔ یہ اسی قوت کا اعجاز ہے کہ لوگ ذاتی اغراض و منافع کی پرستش سے بلند ہو کر اجتماعی مفادات کی خاطر زندہ رہنا سیکھتے ہیں۔ جب یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر قومیں صفحہ ہستی سے خود بخود مٹ جاتی ہیں اور کوئی خارجی سہارا انہیں زندگی عطا نہیں کر سکتا۔

یہ قوت چونکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے دنیا کی کسی غاصب قوم نے

جب بھی اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ایک کمزور قوم پر دستِ ظلم دراز کیا تو اُس نے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس امر کی کوشش کی کہ کسی طرح مفتوح قوم کے فکر و نگاہ کو بدل دیا جائے کیونکہ اس کے تبدیل ہو جانے سے پھر اُس کا مقصد بآسانی حل ہو سکتا ہے "تیر و سناں" افراد کو موت کے گھاٹ تو اتار سکتے ہیں مگر قوموں کو فنا نہیں کر سکتے۔ قوموں کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں اس گنجِ گرانمایہ سے محروم کر دیا جائے جس کے بل بوتے پر اُن کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے اور جس کے لٹ جانے کے ساتھ ہی وہ قومیں قومیں نہیں رہتیں بلکہ بے ضمیر انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ بن جاتی ہیں جنہیں استعمار کی قوت جس طرف چاہتی ہے بے زبان جانوروں کی طرح بالکل میکانکی طور پر ہانک لے جاتی ہے

پھر امتِ مسلمہ کے حق میں اس "نسخۂ کیمیا" کو تو خاص طور پر آزمایا گیا ہے۔ وہ لوگ جو اس قوم کے مزاج سے واقف ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کی تشکیل و ترتیب میں خاک و خون کے مادی رشتوں اور خاندانی، قبائلی اور گروہی تعصبات اور نسلی یا ملکی مفادات کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ اس کی قومیت کی اساس محض ایک تنزیہی تصور ہے جس کا تحقق ملتِ بیضا کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس بنا پر ایک تصور ہی یہاں ایک قوم کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اسی سے زندگی کے مختلف چشمے پھوٹتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک ایمان کی حیثیت محض ایک مجموعۂ افکار کی نہیں بلکہ یہ اس قوم کا مبداء اور اساس ہے۔ مسلمان جب تک مسلمان ہیں کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طرزِ فکر کے مطابق کام کریں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو اُن کے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل مغائر ہو۔ اگر دنیا کی کوئی قوم قوت و طاقت کے بل بوتے پر یا چالبازی اور عیاری کے سحر سے اس ملت کو دین سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ اُس نے بازی جیت لی، کیونکہ دین کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کا وجود بالکل بے معنی

ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا کی جن جن قوموں نے مسلمانوں کو زیر کرنا چاہا، وہ مدت بھر کے تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے ہاتھوں سے تیغ وسناں کا چھین لینا اس قدر ضروری نہیں جس قدر کہ ان کے دل و دماغ سے متاعِ ایمان کی قیمت و اہمیت کو کم کر دینا ہے۔ دیگر ممالک اسلامیہ کا ذکر چھڑ گیا تو یہ داستان بڑی طویل ہو جائیگی۔ اس لیے سردست ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اس برصغیر کے مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو ایک جنسِ کاسد ٹھہرانے کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں۔

غیر ملکی سامراج نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو ضابطہ طے کیا اس کی پہلی شق یہ ہے کہ اس قوم کو معاشی حیثیت سے اتنا پامال کیا جائے کہ وہ اپنی قیمتی سے قیمتی متاع بھی منڈی میں بیچنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ پھر اسے روٹی کا لالچ دے کر کہا جائے کہ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس گراں بہا شئے کا بھی سودا کرو۔ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ان حربوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے جو مسلمان کو مفلس اور قلاش بنانے کے لیے استعمال کیے گئے۔ وہ لکھتا ہے:

"مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمۂ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اگرچہ اس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرزِ عمل سے بنگال کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے انہیں دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لیے خارج کر دیا کیونکہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لیے از حد ضروری تھا مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں ان پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بیدخلی

مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی بے انصافی ہے اور اُن کے پرانے نظامِ مالیات سے ہمارا انحراف صریحًا وعدہ خلافی ہے۔"

"اُن کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات و واقعات پر زور دینا ناواجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہیے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ مسلمان کلکٹر ہی مالگزاری جمع کرتے تھے۔ مسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔"

"تمام نظامِ حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تیس رہ گیا ہے اور وہ بھی ان گزٹڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ قریب قریب معدوم ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے۔ دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان قلی، چپراسی یا دفتری یا قلم بنانے والے کی آسامی سے اوپر کسی اسامی کا متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ ہیں وہ حربے جن کی مدد سے اسی ڈاکٹر کے الفاظ میں "بتدریج اسلامی ہندوستان دارالحرب بنا دیا گیا اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی"۔ سلطنت چھن گئی۔ جماعت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اسلامی قوانین معطل ہوئے اسلامی تہذیب کو سہارا دینے والی تعلیم بھی باقی نہ رہی۔ ساری قوم جہالت کا شکار ہوئی۔ اس پر

مزید اس کو پیٹ کی مار دی گئی، معیشت کے دروازے اس پر ایک ایک کر کے بند کیے گئے۔ اس کو اُن لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار کیا گیا جو کل تک خود اس کے محکوم تھے۔ اور اس کو ایک قلیل مدت کے اندر فقیروں اور قلاشوں کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس طرح مسلمان کے ایمان کی قیمت گرنا شروع ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ مارکیٹ میں ایک جنسِ فروختنی کی حیثیت سے آ گیا۔

مسلمان کے ساتھ یہ سلوک کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ ہندوؤں یا انگریزوں کے مقابلے میں اُن کی ذہنی استعداد کم تھی اور اُن میں امورِ مملکت چلانے کی صلاحیت نہ تھی۔ مسلمانوں کی ذہانت اور فطانت کا خود حاکم قوم کے سرکردہ لوگوں نے بھی اعتراف کیا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ اس کے افراد نہ صرف جرأت اور قوتِ بازو رکھتے تھے بلکہ سیاست میں بھی سب سے ارفع و اعلیٰ تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع میں انہیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان)

"علم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ہندو اُن کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔"

(بغاوتِ ہند اور ہماری آئندہ پالیسی از ہنری ہرنگٹن طامس)

مسلمانوں کو اگر معاشی اعتبار سے تباہ حال کیا گیا تو اس کے پیچھے صرف یہی ایک ناپاک جذبہ کام کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ لوگ پیٹ کی خاطر ایمان کو بھینٹ چڑھا دیں۔ اُمتِ مسلمہ پہلے تو اس پر قطعاً تیار نہ ہوئی اور ایک زبردست کشمکش کے ساتھ اس جنس گراں مایہ کی حفاظت اور پاسبانی کی مگر جب دنیا اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اس پر تنگ ہو گئی اور اس کے افراد کے لیے جسم و روح کے رشتے کا قائم رکھنا ناممکن ہو گیا تو پھر سب سے پہلے اس نے اپنی عزتِ نفس

کو حاکم قوم کے قدموں میں لا ڈالا۔ مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کا اندازہ ذیل کی اس عرضداشت سے لگایا جاسکتا ہے جو افلاس سے مارے ہوئے ان مجبور انسانوں نے اڑلیسہ کے کمشنر کے سامنے پیش کی:

"ہز میجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو اڑلیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جارہا ہے اور ان کے سربلند ہونے کی کوئی امید نہیں۔ مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اب ہماری حالت ماہی بے آب کی طرح ہو رہی ہے مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم حضور کی خدمت میں اس یقین کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں کہ حضور ہی اڑلیسہ کے ڈویژن میں ہز میجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ اپنی سابقہ ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دنیا کے دور دراز گوشوں کا رخ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لیے مستعد ہیں۔ ہم سائیبریا کے بے آب و گیاہ حصوں میں مارے مارے پھرنے کے لیے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں دس شلنگ (تقریباً ساڑھے سات روپے) ہفتہ کی ملازمت سے نوازا جائے گا۔"

اس عرضداشت کو بار بار پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ عرضداشت کن لوگوں کی طرف سے پیش کی جارہی ہے۔ وہ جن کے قدموں میں دنیا نے کبھی اپنے سارے خزانے لاکر ڈال دیئے مگر انہوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، وہ جن کا دستِ سوال کبھی بھی کسی انسان کے سامنے دراز نہ ہوا تھا۔ وہ جن کی پیشانیاں مالک الملک کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنے نہ پاتی تھیں، وہ آج

ذلیل و خوار ہو کر ایک ظالم قوم کے حضور میں دادرسی کے لیے فریاد کر رہے ہیں اور اپنی اُس عزتِ نفس کا سودا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں جو ایمان کا ہی ایک لازمی جزو ہے۔

پیٹ کی مار دے کر ایمان سلب کرنے کے علاوہ انگریزوں نے مسلمانوں کے دین و ایمان پر براہِ راست ڈاکہ ڈالنے کی بھی بہت سی منظم کوششیں کیں اور اُن میں سب سے کھلی ہوئی کوشش عیسائی مشنریوں کا قیام ہے۔ ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی کہ سیرام پور میں سب سے پہلا مشن ولیم کیرے اور اس کے رفقاء کار کی زیر نگرانی قائم ہو گیا اور انہوں نے ۱۷۹۳ء میں یہاں سب سے پہلا کالج قائم کیا۔ اس وقت تک حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ کمپنی اسے قرینِ مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ ایسی جماعتوں کو کھلم کھلا اپنی سرپرستی میں لے لیا جائے جو اہلِ ہند کے جذبات کو مشتعل کرنے کا باعث بنیں۔ لیکن اس وقت بھی سرکار انگریزی کے پیشِ نظر یہی مقصد تھا کہ اس ملک کے رہنے والے لوگوں کو مذہب سے بیزار کر دیا جائے۔ چنانچہ آنریبل مسٹر الفنسٹن اور آنریبل الیف وارڈ اپنی اسی یادداشت میں جس میں انہوں نے حکومت کو اس بات کا مشورہ دیا ہے کہ اسے اس الزام کے رفع کرنے کے لیے کہ حکومت اہلِ ہند کا مذہب تبدیل کرنا چاہتی ہے کچھ کرنا چاہیے، یہ بھی فرمایا ہے:

> "میں علانیہ تو نہیں مگر در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے۔ تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں، خواہ تعلیم سے ان کی آراء میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم اس سے وہ زیادہ ایماندار اور محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔"

اس طرزِ عمل کے پیشِ نظر اگرچہ مسلمانوں کو بالجبر عیسائی بنانے کا تو کوئی پروگرام طے نہ کیا

جا سکتا تھا مگر عیسائی مشنریوں کے اندھے جوش نے اُن کے اس کام کو "در پردہ" نہ رہنے دیا اور بلی جلد ہی تھیلے سے باہر آگئی۔ چارلس گرانٹ نے اپنی کتاب میں جو اشاعتِ تعلیم کے بارے میں لکھی تھی صاف کہا ہے:

"ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اس لیے ان کی سوسائٹی نہایت ذلیل و خوار ہے۔ ان خرابیوں کی اصلاح قانون کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہو سکتی خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں۔ دراصل تمام خرابیوں کی جڑ اُن کے مذہبی مراسم ہیں جن کی روح اُن کے قوانین میں موجود ہے اور اُن کے جھوٹے، ناپاک اور مضحکہ خیز مذہبی اصولوں میں مضمر ہے۔ ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہنچائی جائے جو تاریکی میں ہیں۔ بالخصوص ہمارے بانیٔ مذہب کے خالص اور پاک اصول انہیں بتائے جائیں اس بارہ میں ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفیض ہوتے ہیں اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچائیں۔" (بحوالہ تاریخ التعلیم مصنفہ جسٹس سید محمود)

یہاں تک تو عیسائیت کا پرچار صرف "اصلاحِ حال" کے لیے تھا کیونکہ حاکم قوم یہ سمجھتی تھی کہ فساد کی جڑ ان اہلِ ہند کے مذہب میں ہے اور جب تک اس جڑ کو کاٹ کر پھینکا نہیں جاتا اُس وقت تک یہ لوگ مہذب اور متمدن نہیں بن سکتے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اس ہمدردی کے جذبہ پر سے بھی پردہ چاک ہوا اور معلوم ہوا کہ عیسائیت کی تبلیغ کی غایت انسانی فلاح نہیں بلکہ ایک جارحانہ عزم ہے جسے نہ معلوم انگریزی قوم نے کتنی مدت سے سینے میں پال رکھا تھا۔ مینگلس نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا:

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ ہونا چاہیے۔"

(حکومت خود اختیاری) (باقی صفحہ ۶۴ پر)

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

تفہیم القرآن

النمل

(۳)

اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو[۵۷] یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے[۵۸]۔ صالح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، بھلائی سے پہلے برائی

---

۵۷ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحات ۴۷ تا ۵۰۔ ۹۴۳ تا ۳۵۳۔ الشعراء رکوع ۸۔ القمر رکوع ۲۔ الشمس آیات ۱۱۔۱۵۔

۵۸ یعنی جونہی کہ حضرت صالح کی دعوت کا آغاز ہوا، ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا۔ اور اس تفرقہ کے ساتھ ہی ان کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی، جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۔ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ "اس کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے تھے انہوں نے اُن لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، جو اُن میں سے ایمان لائے تھے، کہا، کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو لیکر وہ بھیجے گئے ہیں۔ ان متکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کے ہم کافر ہیں" (الاعراف، رکوع ۱۰)۔ یاد رہے کہ ٹھیک یہی صورت حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ مکہ میں بھی پیدا ہوئی تھی کہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں گروہوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اس لیے یہ قصہ آپ سے آپ ان حالات پر چسپاں ہو رہا تھا جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟[59] کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے۔"
انہوں نے کہا "ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے۔"[60] صالح نے جواب دیا "تمہارے

[59] یعنی اللہ سے خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگنے میں کیوں جلدی کرتے ہو؟ دوسرے مقام پر قوم صالح کے سرداروں کا یہ قول نقل ہو چکا ہے کہ یَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ "اے صالح، لے آ وہ عذاب ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی رسولوں میں سے ہے" (الاعراف۔ رکوع ۱۰)

[60] ان کے اس قول کا ایک مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ تحریک ہمارے لیے سخت منحوس ثابت ہوئی ہے جب سے تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے دینِ آبائی کے خلاف یہ بغاوت شروع کی ہے ہم پر آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی رہتی ہے، کیونکہ ہمارے معبود ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ قول اکثر ان مشرک قوموں کے اقوال سے مشابہ ہے جو اپنے انبیاء کو منحوس قرار دیتی تھیں۔ چنانچہ سورہ یٰسین میں ایک قوم کا ذکر آتا ہے کہ اس نے اپنے انبیاء سے کہا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ "ہم نے تم کو منحوس پایا ہے" (رکوع ۲)۔ یہی بات فرعون کی قوم حضرت موسیٰ کے متعلق کہتی تھی: فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ "جب ان پر کوئی اچھا وقت آتا تو کہتے کہ ہمارے لیے یہی ہے اور جب کوئی مصیبت آجاتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کو اس کا ذمہ دار ٹھیراتے"۔ قریب قریب ایسی ہی باتیں مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہی جاتی تھیں۔

دوسرا مطلب اس قول کا یہ ہے کہ تمہارے آتے ہی ہماری قوم میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ پہلے ہم ایک قوم تھے جو ایک دین پر مجتمع تھی۔ تم ایسے منحوس قدم آئے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور بیٹا باپ سے کٹ گیا۔ اس طرح قوم کے اندر ایک نئی قوم اٹھ کھڑی ہونے کا انجام ہمیں اچھا نظر نہیں آتا۔ یہی وہ الزام تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپ کے خلاف بار بار پیش کرتے تھے۔ آپ کی دعوت کا آغاز ہوتے ہی سرداران قریش کا جو وفد ابو طالب کے پاس گیا تھا اس نے یہی کہا تھا کہ "اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالہ کر دو جس نے تمہارے دین اور تمہارے باپ دادا کے دین کی مخالفت کی ہے اور تمہاری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے اور ساری قوم کو بے وقوف قرار دیا ہے"۔ (ابن ہشام جلد اول، ص ۲۸۵)۔ حج کے موقع پر جب کفار مکہ کو اندیشہ ہوا کہ باہر کے زائرین آکر کہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نیک و بد شگون کا سررشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے[۶۱]۔"
اُس شہر میں نو جتھے دار تھے[۶۲] جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے[۶۳] کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں[۶۴]۔" یہ

کی دعوت سے متاثر نہ ہو جائیں تو انہوں نے باہم مشورہ کرنے کے بعد یہی طے کیا کہ قبائل عرب سے کہا جائے: "یہ شخص جادوگر ہے، اس کے جادو کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بیٹا باپ سے، بھائی بھائی سے، بیوی شوہر سے اور آدمی اپنے سارے خاندان سے کٹ جاتا ہے۔" (ابن ہشام، ص ۲۸۹)

۶۱ یعنی بات وہ نہیں ہے جو تم نے سمجھ رکھی ہے۔ اصل معاملہ جسے اب تک تم نہیں سمجھے ہو یہ ہے کہ میرے آنے سے تمہارا امتحان شروع ہو گیا ہے۔ جب تک میں نہ آیا تھا، تم اپنی جہالت میں ایک ڈگر پر چلے جا رہے تھے۔ حق اور باطل کا کوئی کھلا امتیاز سامنے نہ تھا۔ کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کا کوئی معیار نہ تھا۔ بدتر سے بدتر لوگ اونچے ہو رہے تھے، اور اچھی سے اچھی صلاحیتوں کے لوگ خاک میں ملے جا رہے تھے۔ مگر اب ایک کسوٹی آگئی ہے جس پر تم سب جانچے اور پرکھے جاؤ گے۔ اب بیچ میدان میں ایک ترازو رکھ دیا گیا ہے جو ہر ایک کو اس کے وزن کے لحاظ سے تولے گا۔ اب حق اور باطل آمنے سامنے موجود ہیں۔ جو حق کو قبول کرے گا وہ بھاری اترے گا خواہ آج تک اس کی کوڑی بھر بھی قیمت نہ رہی ہو۔ اور جو باطل پر جمے گا اس کا وزن رتی بھر بھی نہ رہے گا چاہے وہ آج تک میرالامرا ہی بنا رہا ہو۔ اب فیصلہ اس پر نہیں ہو گا کہ کون کس خاندان کا ہے، اور کس کے ذرائع و وسائل کتنے ہیں، اور کون کتنا زور رکھتا ہے، بلکہ اس پر ہو گا کہ کون سیدھی طرح صداقت کو قبول کرتا ہے اور کون جھوٹ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیتا ہے۔

۶۲ یعنی ۹ سردارانِ قبائل جن میں سے ہر ایک اپنے ساتھ ایک بڑا جتھا رکھتا تھا۔

۶۳ یعنی حضرت صالح علیہ السلام کے قبیلے کے سردار سے، جس کو قدیم قبائلی رسم و رواج کے مطابق ان کے خون کے دعوے کا حق پہنچتا تھا۔ یہ وہی پوزیشن تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے چچا ابوطالب کو حاصل تھی۔ کفارِ قریش بھی اسی اندیشے سے ہاتھ روکتے تھے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں گے تو ابوطالب خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں گے۔

چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی ۶۵۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر خالی پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے، اس میں ایک نشانِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں ۶۶۔ اور بچالیا

۶۴ یہ بعینہ اسی نوعیت کی سازش تھی جیسی مکہ کے قبائلی سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سوچتے رہتے تھے، اور بالآخر یہی سازش انہوں نے ہجرت کے موقع پر حضورؐ کو قتل کرنے کے لیے کی یعنی یہ کہ سب قبیلوں کے لوگ مل کر آپ پر حملہ کریں تاکہ بنی ہاشم کسی ایک قبیلے کو ملزم نہ ٹھیرا سکیں اور سب قبیلوں سے بیک وقت لڑنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

۶۵ یعنی قبل اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالح کے ہاں شبخون مارتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سازش ان لوگوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورۂ ہود میں ذکر آتا ہے کہ جب انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالح نے انہیں نوٹس دیا کہ بس اب تین دن مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آجائیگا (فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ، ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ)۔ اس پر شاید انہوں نے سوچا ہو گا کہ صالح کا عذاب موعود تو آئے چاہے نہ آئے، ہم لگے ہاتھوں اس کا بھی کام تمام کیوں نہ کر دیں۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ انہوں نے شبخون مارنے کے لیے وہی رات تجویز کی ہو گی جس رات عذاب آنا تھا اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالح پر پڑتا خدا کا زبردست ہاتھ ان پر پڑ گیا۔

۶۶ یعنی جاہلوں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ حضرت صالح اور ان کی اونٹنی کے معاملہ سے اُس زلزلے کا کوئی تعلق نہیں ہے جو قومِ ثمود پر آیا، یہ چیزیں تو اپنے طبیعی اسباب سے آیا کرتی ہیں، ان کے آنے یا نہ آنے میں اس چیز کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا کہ کون اس علاقے میں نیکوکار تھا اور کون بدکار اور کس نے کس پر ظلم کیا تھا اور کس نے رحم کیا تھا، یہ محض واعظانہ ڈھکوسلے ہیں کہ فلاں شہر یا فلاں علاقہ فسق و فجور سے بھر گیا تھا اس لیے اس پر سیلاب آگیا یا زلزلے نے اس کی بستیاں الٹ دیں یا کسی اور بلائے ناگہانی نے اسے تل پٹ کر ڈالا۔ لیکن جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی اندھا بہرا خدا اس کائنات پر حکومت

ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔

اور لوطؑ[۶۷] کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟[۶۸] کیا تمہارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو"[۶۹]۔ مگر اُس کی قوم کا جواب اس کے

نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک حکیم و دانا ہستی یہاں قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے۔ اس کے فیصلے طبیعی اسباب کے غلام نہیں ہیں بلکہ طبیعی اسباب اس کے ارادے کے غلام ہیں۔ اس کے ہاں قوموں کو گرانے اور اٹھانے کے فیصلے اندھا دھند نہیں کیے جاتے بلکہ حکمت اور عدل کے ساتھ کیے جاتے ہیں اور ایک قانونِ مکافات بھی اس کی کتابِ آئین میں شامل ہے جس کی رو سے اخلاقی بنیادوں پر اس دنیا میں بھی ظالم کیفرِ کردار کو پہنچائے جاتے ہیں۔ ان حقیقتوں سے جو لوگ باخبر ہیں وہ اس زلزلے کو اسبابِ طبیعی کا نتیجہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ وہ اسے اپنے حق میں تنبیہ کا کوڑا سمجھیں گے۔ وہ اس سے عبرت حاصل کریں گے۔ وہ اُن اخلاقی اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جن کی بنا پر خالق نے اپنی پیدا کی ہوئی ایک پھلتی پھولتی قوم کو غارت کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے رویّے کو اُس راہ سے ہٹائیں گے جو اس کا غضب لانے والی ہے اور اس راہ پر ڈالیں گے جو اس کی رحمت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔

[۶۷] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم صفحات ۵۱ تا ۵۳۔ ۳۵۴ تا ۳۵۹۔ ۵۱۱ تا ۵۱۵۔ الانبیاء، رکوع ۵۔ الشعراء، رکوع ۹۔ العنکبوت، رکوع ۳۔۴۔ الصافات، رکوع ۴۔ القمر، رکوع ۲۔

[۶۸] اس ارشاد کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تم اس فعل کے فحش اور کارِ بد ہونے سے ناواقف نہیں ہو، بلکہ جانتے بوجھتے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہو کہ مرد کی خواہشِ نفس کے لیے مرد نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ عورت پیدا کی گئی ہے، اور مرد و عورت کا فرق بھی ایسا نہیں ہے کہ تمہاری آنکھوں کو نظر نہ آتا ہو، مگر تم کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ جیتی مکھی نگلتے ہو۔ تیسرے یہ کہ تم علانیہ یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جب کہ دیکھنے والی آنکھیں تمہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں، جیسا کہ آگے سورۂ عنکبوت میں آرہا ہے: "وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ" "اور تم اپنی مجلسوں میں بُرا کام کرتے ہو" (رکوع ۳)۔

[۶۹] جہالت کا لفظ یہاں حماقت اور سفاہت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اردو زبان میں بھی ہم گالی گلوچ

سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں"۔ آخر کار ہم نے بچا لیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو، بجز اُس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا، اور برسائی اُن لوگوں پر ایک برسات، بہت ہی بُری برسات تھی وہ اُن لوگوں کے حق میں جو متنبہ کیے جا چکے تھے ع

(اے نبی)، کہو، حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا[۷۱]
(ان سے پوچھو) اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک ٹھیرا رہے ہیں[۷۲]؟ بھلا وہ کون ہے

اور بیہودہ حرکات کرنے والے کو کہتے ہیں کہ وہ جہالت پر اتر آیا ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (الفرقان، رکوع ۶) لیکن اگر اس لفظ کو بے علمی ہی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی ان حرکات کے بُرے انجام کو نہیں جانتے۔ تم یہ تو جانتے ہو کہ یہ ایک لذتِ نفس ہے جو تم حاصل کر رہے ہو۔ مگر تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس انتہائی مجرمانہ اور گھناؤنی لذت چشی کا کیسا سخت خمیازہ تمہیں عنقریب بھگتنا پڑیگا۔ خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار کھڑا ہے اور تم ہو کہ انجام سے بے خبر اپنے اس گندے کھیل میں منہمک ہو۔

۷۰ یعنی پہلے ہی حضرت لوطؑ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس عورت کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں کیونکہ اسے اپنی قوم کے ساتھ ہی تباہ ہونا ہے۔

۷۱ یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے اور یہ فقرہ اس کی تمہید ہے۔ اس تمہید سے یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تقریر کا آغاز کس طرح کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والے لوگ ہمیشہ سے اپنی تقریریں اللہ کی حمد اور اس کے نیک بندوں پر سلام سے شروع کرتے رہے ہیں۔ مگر اب اسے ملائیت سمجھا جانے لگا ہے اور موجودہ زمانے کے مسلمان مقررین اس سے کلام کی ابتدا کرنے کا تصور تک اپنے ذہن میں نہیں رکھتے۔ یا پھر اس میں شرم محسوس کرتے ہیں۔

۷۲ بظاہر یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بہتر ہے یا یہ معبودانِ باطل۔ حقیقت کے اعتبار سے تو معبودانِ باطل میں سرے سے کسی خیر کا سوال ہی نہیں ہے کہ اللہ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رہے مشرکین

جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے[73]؟ نہیں، بلکہ یہی لوگ راہ راست سے[74] ہٹ کر چلے جارہے ہیں۔

تو وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ اللہ کا اور ان معبودوں کا کوئی مقابلہ ہے۔ لیکن یہ سوال ان کے سامنے اس لیے رکھا گیا کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص دنیا میں کوئی کام بھی اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ اپنے نزدیک اس میں کسی بھلائی یا فائدے کا خیال نہ رکھتا ہو۔ اب اگر یہ مشرک لوگ اللہ کی عبادت کے بجائے ان معبودوں کی عبادت کرتے تھے، اور اللہ کو چھوڑ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرتے تھے، تو یہ اس کے بغیر بالکل بے معنی تھا کہ ان معبودوں میں کوئی خیر ہو۔ اسی بنا پر ان کے سامنے صاف الفاظ میں یہ سوال رکھا گیا کہ بتاؤ اللہ بہتر ہے یا تمہارے یہ معبود؟ کیونکہ اس دوٹوک سوال کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ ان میں سے کوئی کٹے سے کٹا مشرک بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ ہمارے معبود بہتر ہیں۔ اور یہ مان لینے کے بعد کہ اللہ بہتر ہے، ان کے پورے دین کی بنیاد ڈھے جاتی تھی، اس لیے کہ پھر یہ بات سراسر نامعقول قرار پاتی تھی کہ بہتر کو چھوڑ کر بدتر کو اختیار کیا جائے۔

اس طرح قرآن نے تقریر کے پہلے ہی فقرے میں مخالفین کو بے بس کر دیا۔ اس کے بعد پے در پے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کے ایک ایک کرشمے کی طرف انگلی اٹھا کر پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ یہ کام کس کے ہیں؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ دوسرے آخر کیا ہیں کہ انہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کی تلاوت فرماتے تو فوراً اس کے جواب میں فرماتے بَلِ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى وَاَجَلُّ وَاَكْرَمُ، "نہیں بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا اور بزرگ و برتر ہے"۔

۷۳ے مشرکوں میں سے کوئی بھی اس سوال کا یہ جواب نہ دے سکتا تھا کہ یہ کام اللہ کے سوا

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور

کسی اور کے ہیں، یا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ان میں شریک ہے۔ قرآن مجید دوسرے مقامات پر کفار مکہ اور مشرکین عرب کے متعلق کہتا ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ " اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے اس زبردست علم والے نے ہی ان کو پیدا کیا ہے" (الزخرف۔ رکوع ۱) وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ " اور اگر ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے" (الزخرف۔ رکوع ۷) وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ " اور اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے" (العنکبوت۔ رکوع ۶) قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ . . . . وَمَنْ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ " ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون جاندار کو بے جان میں سے اور بے جان کو جاندار میں سے نکالتا ہے؟ کون اس نظام عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ" (یونس۔ رکوع ۴)۔ عرب کے مشرکین ہی نہیں، دنیا بھر کے مشرکین بالعموم یہی مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اور نظام کائنات کا مدبر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے اس سوال کا یہ جواب اُن میں سے کوئی شخص ہٹ دھرمی کی بنا پر برائے بحث بھی نہ دے سکتا تھا کہ ہمارے معبود خدا کے ساتھ ان کاموں میں شریک ہیں، کیونکہ اگر وہ ایسا کہتا تو اس کی اپنی ہی قوم کے ہزارہا آدمی اس کو جھٹلا دیتے اور صاف کہتے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریت کا ابطال بھی ہے۔ مثلاً اسی پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی نباتات اُگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجیے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر ٹھیک وہ اوصاف موجود ہونا جو حیواتی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی

اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے

کا پے درپے سمندروں سے اٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما نصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے، کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانشمندانہ تدبیر اور غالب قدرت و ارادے کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ مسلسل ہزار ہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی، جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو، اسے ایک امر اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔

سے زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آجانے سے بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں، تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے جس سے رات اور دن کا اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ اس کرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوفناک بم باری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب، جو ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں، یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار

[illegible]

دیکھیے، اس کرے کی سطح پر ایک طرف تو بے شمار قسم کے معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزاء جمع کر دیے
گئے ہیں جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ جس جگہ یہ سروسامان مفقود ہوتا ہے وہاں کوئی بھی
زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اس کرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیر زمین سوتوں کی شکل
میں پانی کا ایک عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کر کے جگہ جگہ
کر پگھلنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام اشیاء
کو زمین پر تھامے رکھنے کے لیے اس کرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر
کم ہوتی تو ہوا اور پانی دونوں کو یہ روک نہ سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہو جاتا کہ یہاں زندگی دشوار ہو جاتی۔ یہ کشش اگر
زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہو جاتی، اس کا دباؤ بہت بڑھ جاتا، بخاراتِ آبی کا اٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہو
سکتیں، سردی زیادہ ہوتی، زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے، بلکہ کششِ ثقل بہت زیادہ ہونے
کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل و حرکت بھی ان کے لیے
مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں اس کرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔
اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو اسے سورج سے حرارت کم ملتی، سردی بہت زیادہ ہوتی، موسم بہت لمبے ہوتے، اور
مشکل ہی سے یہ آبادی کے قابل ہوتا۔ اور اگر فاصلہ کم ہوتا تو اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی
چیزیں مل جل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ بننے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی
شخص عقل رکھتا ہو اور ان امور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کسی خالق
حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثہ کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں۔ اور نہ یہ گمان کر
سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور عمل میں لانے میں کسی دیوی، دیوتا، یا جن، یا نبی، یا ولی، یا
فرشتے کا کوئی دخل ہے۔

ف۱ [illegible] پانی کے ذخیرے، جو اس کی زمین پر موجود ہیں، مگر ہم [illegible]

کون ہے جو بیقرار ہو کر پکارنے والے کی دعا سنتا ہے اور اس کی مصیبت ٹال دیتا ہے؟[۷۳] اور کون ہے جو، تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟[۷۴] کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔

اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے[۷۵] اور کون اپنی رحمت کے آگے

پانی کی سوتیں بسا اوقات ایک ہی علاقے میں کھاری پانی الگ اور میٹھا پانی الگ لیکر چلتی ہیں۔ کھاری پانی کے سمندر تک میں بعض مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور ان کی دھار سمندر کے پانی سے اس طرح الگ ہوتی ہے کہ بحری مسافر اس میں سے پینے کے لیے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔ (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ الفرقان، حاشیہ ۶۸)

[۷۳] مشرکین عرب خود اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ مصیبت کو ٹالنے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید جگہ جگہ انہیں یاد دلاتا ہے کہ جب تم پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو تم خدا ہی سے فریاد کرتے ہو، مگر جب وہ وقت ٹل جاتا ہے تو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہو۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول صفحات ۵۳۹-۵۴۰۔ جلد دوم صفحات ۲۷۸-۵۴۶-۶۳۱) - اور یہ بات صرف مشرکین عرب ہی تک محدود نہیں ہے۔ دنیا بھر کے مشرکین کا بالعموم یہی حال ہے۔ حتیٰ کہ روس کے منکرین خدا جنہوں نے خداپرستی کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے، ان پر بھی جب گزشتہ جنگ عظیم میں جرمن فوجوں کا نرغہ سخت ہو گیا تو انہیں خدا کو پکارنے کی ضرورت محسوس ہو گئی تھی۔

[۷۴] اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم اٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو زمین میں تصرف اور فرمانروائی کے اختیارات عطا کرتا ہے۔

[۷۵] یعنی جس نے ستاروں کے ذریعہ سے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی اپنا راستہ تلاش کر سکتے ہو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ تدبیروں میں سے ایک ہے کہ اس نے بحری اور بری سفروں میں انسان کی رہنمائی کے لیے وہ ذرائع پیدا کر دیئے ہیں جن سے وہ اپنی سمت سفر، اور منزل مقصود کی طرف اپنی راہ متعین کرتا ہے۔ دن کے وقت زمین کی مختلف علامتیں اور آفتاب کے طلوع و غروب کی سمتیں

ہواؤں کو خوشخبری لیکر بھیجتا ہے ؟[۷۹] کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا ہے ؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے ؟[۸۰] اور کون تم کو آسمان اور زمین سے

اس کی مدد کرتی ہیں اور تاریک راتوں میں تارے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ان سب کو اللہ تعالیٰ کے احسانات میں شمار کیا گیا ہے : وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (رکوع ۲)

۷۹ۂ رحمت سے مراد ہے بارش جس کے آنے سے پہلے ہوائیں اس کی آمد آمد کی خبر دے دیتی ہیں۔

۸۰ۂ یہ سادہ سی بات جس کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دور تک اترتا جاتا ہے اتنے ہی وجودِ الٰہ اور وحدتِ الٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھیے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اس وقت تک مسلّم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں ان سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آجانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانونِ بخت و اتفاق (LAW OF CHANGE) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (LABORATORIES) میں بے جان مادے سے جاندار مادہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادہ ہے جسے اصطلاح میں (D.N.A) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے، جوہرِ حیات ہے، مگر خود جاندار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھیے۔ زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا

رزق دیتا ہے[۸۱]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ

پتہ چلتا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (DESIGN) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں بھی دو نوعوں کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیات کا ڈھانچہ توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ متحجرات (FOSSILS) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خنثیٰ مشکل کہیں نہیں ملا ہے۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورتِ نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے، اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق البارئ المصوِّر ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ۔ اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوع حیوانی و نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل MECHANISM رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی چھوٹوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علمِ تناسل (GENETICS) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں ممیز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے

اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۸۲

کے ایک خلیے (CELL) کے ایک حصہ میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشوونما کو ٹھیک اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورتِ نوعیہ کا راستہ ہے۔ اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانہ سے آج تک جتنے پودے بھی دنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں انہوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے، کسی آب و ہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانۂ جَو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصور وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اُسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالد و تناسل کے اُس خورد بینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصے میں لیے ہوئے ہوتا ہے، اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور ان بے انتہا لطیف و پُرپیچ عملیات (PROCESSES) کو دیکھے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخمِ تناسل اسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبر اور ایک حیّ و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی اِن کارخانوں کی نگرانی و رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق یہ گمان کر سکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی ذرہ برابر بھی کوئی حصہ رکھتا ہے۔ اور کون صاحبِ عقل آدمی تعصب سے پاک ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق اس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلے جا رہا ہے۔

(بقیہ حواشی صفحہ سابق)

۱ؔ؎ رزق دینے کا معاملہ بھی اتنا سادہ نہیں ہے جتنا سرسری طور پر ان مختصر سے الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص محسوس کرتا ہے۔ اس زمین پر لاکھوں انواع حیوانات کی اور لاکھوں ہی نباتات کی پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کے اربوں افراد موجود ہیں، اور ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ ہیں۔ خالق نے ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اس کثرت سے اور ہر ایک کی دسترس کے اس قدر قریب فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں رہ جاتے۔ پھر اس انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل جل کر کام کرتی ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ گرمی، روشنی، ہوا، پانی اور زمین کے مختلف الاقسام مادوں کے درمیان اگر ٹھیک تناسب کے ساتھ تعاون نہ ہو تو غذا کا ایک ذرہ بھی وجود میں نہیں آسکتا۔

کون شخص تصور کر سکتا ہے کہ یہ حکیمانہ انتظام ایک مدبر کی تدبیر اور سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر یونہی اتفاقاً ہو سکتا تھا؟ اور کون اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے کہ اس انتظام میں کسی جن یا فرشتے یا کسی بزرگ کی روح کا کوئی دخل ہے؟

۲ؔ؎ یعنی یا تو اس بات پر دلیل لاؤ کہ ان کاموں میں واقعی کوئی اور بھی شریک ہے، یا نہیں تو پھر کسی معقول دلیل سے یہی بات سمجھا دو کہ یہ سارے کام تو ہوں صرف ایک اللہ کے مگر بندگی و عبادت کا حق پہنچے اس کے سوا کسی اور کو، یا اس کے ساتھ کسی اور کو بھی۔

فقہ اسلامی کی انسائیکلوپیڈیا

ایک عظیم منصوبہ

[موجودہ دور میں اسلامی قانون کو قابلِ عمل بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے نئے سرے سے مدون کیا جائے۔ اس وقت ہمارے پاس اسلامی قانون کا جس قدر ذخیرہ موجود ہے وہ قدیم طرز کی فقہی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ ان کا اسلوب بیان اور اندازِ ترتیب زمانۂ حال کی قانونی زبان اور ترتیب سے یکسر مختلف ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمارے پڑھے لکھے لوگ عموماً اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے ہیں چنانچہ اس امر کی ایک عرصہ سے بشدت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ذمہ دار علماء اور ماہرین قانون کا ایک بورڈ پورے فقہی سرمایہ کا جائزہ لے اور اس کے مضامین کو موجودہ زمانہ کی قانونی کتابوں کے طرز پر جدید اصطلاحات کی زبان میں از سرِ نو مرتب کرے۔ منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرے، فہرستوں اور انڈکسوں کے ذریعے اس مواد کو سہل الحصول بنائے۔ لیکن یہ کام جس قدر ژرف نگاہی، محنت، وقت اور مالی وسائل کی فراوانی چاہتا ہے اس کے پیش نظر کسی ادارے کے لیے اس کا بیڑہ اٹھانا آسان نہیں تھا۔

شام یونیورسٹی کا نوخیز شریعت کالج، جو چار سال سے فقہ و شریعت کے میدان میں مفید خدمات سر انجام دے رہا ہے، اس لحاظ سے تمام ملتِ اسلامی کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اس اہم ملی فریضہ کو سر انجام دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور فقہ اسلامی کو جدید سائنٹفک طرز کے مطابق انسائیکلوپیڈیا کی صورت میں مرتب کرنے کا آغاز کر دیا ہے انسائیکلو پیڈیا کی تدوین و تالیف کے پورے کام کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے

شریعت کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اس کے چیئرمین مقرر ہوئے ہیں کمیٹی کی طرف سے انسائیکلو پیڈیا کی اسکیم پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے دنیا بھر کے نمایاں اہل علم حضرات کے پاس بھیجی گئی ہے اور اس سلسلے میں ان سے تجاویز اور مشورے اور ہر ممکن تعاون کی درخواست کی گئی ہے۔ اسکیم کی ایک کاپی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس بھی آئی ہے، مولانا محترم نے ڈاکٹر سباعی صاحب کو اس عظیم الشان اقدام پر مبارک باد بھیجنے کے ساتھ اپنی طرف سے ہر طرح کے تعاون و مساعدت کا یقین دلایا ہے۔ اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو بھی توجہ دلائیں گے کہ وہ اس کام میں آپ سے تعاون کریں اور اس انسائیکلو پیڈیا کو عربی کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی زبان میں بھی شائع کرنے کا انتظام کریں۔ مولانا نے کمیٹی کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے کہ انسائیکلو پیڈیا کے تمام موضوع عالم اسلامی کے ثقہ اور محقق علماء سے لکھوائے جائیں تاکہ یہ مجموعہ بحث و تحقیق اور تجزیہ و تحلیل میں ہر لحاظ سے قابلِ اطمینان ہو۔ انسائیکلو پیڈیا کی پوری اسکیم ذیل میں درج کی جاتی ہے تاکہ پاکستان کے اہلِ علم حضرات بھی اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پورا پورا تعاون کریں یہ تمام ملتِ اسلامی کا مشترک کام ہے جیسا کہ اسکیم کے آخر میں بتایا گیا ہے "فقہی انسائیکلو پیڈیا کی تالیف کسی ایک ملک کے اہلِ علم تک محدود نہیں رکھی جا سکتی بلکہ اس میں تمام عالم اسلامی کے ذی استطاعت اور باصلاحیت اہل علم کی شرکت لازمی ہوگی" ــــ [غ - ح]

فقہائے اسلام گزشتہ تیرہ صدیوں میں پوری محنت و ذکاوت اور دیدہ وری کے ساتھ اپنا فریضہ سرانجام دیتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ فقۂ اسلامی نے فکر و تحقیق اور اجتہاد کے میدان میں اس قدر وسیع لٹریچر فراہم کر دیا ہے جس کی قدیم دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس لٹریچر میں جن بلند پایہ علماء کے نتائجِ کاوش شامل ہیں وہ اس کامل یقین کے ساتھ یہ تحقیقی کام سرانجام دیتے رہے ہیں کہ یہ نہ صرف ایک علمی خدمت ہے بلکہ دینی اور ملی فریضہ بھی ہے۔ لیکن جب دورِ حاضر کی آمد ہوئی اور اس کے ساتھ نئے قوانین وجود میں آگئے تو لوگ تمام تر ان کی جانب لپک گئے اور اسلامی فقہ علماء کے ایک مخصوص گروہ کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ رہے علمِ قانون سے وابستگی رکھنے والے دوسرے لوگ تو فقہی کتابوں سے اُن کا سرے سے کوئی مس ہی نہ رہا کیونکہ ان کتابوں کی ترتیب و تبویب جس طرز کی ہے اور ان میں مضامین جس زبان اور اندازِ بیان میں ادا ہوئے ہیں وہ ان کے لیے بالکل غیر مانوس تھا۔ چنانچہ زمانے نے جونہی کچھ اور پیش قدمی کی تو بعض لوگ اس گمان میں مبتلا ہو گئے کہ اسلامی فقہ زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اور وقت کا قافلہ جس مقام پر پہنچ چکا ہے یہ اُس سے کہیں پیچھے ہے۔ اس گمانِ محض کے بھرّے میں اگرچہ ہمارے ملک کے بعض اہلِ قانون بھی آگئے ہیں اور اس کا سبب محض ان کی فقہ سے بے تعلقی ہے لیکن دراصل یہ خیال مغرب کے اکثر محققین کے ذہن کی پیداوار ہے جو اس تصور پر جمے ہوئے ہیں کہ جس دَور میں ہم جی رہے ہیں، فقہ اسلامی کا اس دَور سے سرے سے کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

پیرس کانفرنس میں انسائیکلوپیڈیا کی تالیف کی تجویز جولائی ۱۹۵۱ء میں پیرس یونیورسٹی کے لا کالج میں "ہفتۂ فقہ اسلامی" کے نام سے فقہ پر غور و خوض کے لیے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کی دوسری کانفرنس تھی اور اس کا اہتمام قانون کے تقابلی مطالعہ کی بین الاقوامی اکیڈیمی (INTERNATIONAL ACADEMY OF COMPARITIV STUDY OF LAW) کے شعبۂ قانونِ مشرق کی جانب سے ہوا تھا۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے فرانسیسی ماہرینِ قانون اور مستشرقین کے سامنے پانچ فقہی موضوع زیرِ بحث آئے۔ جو مذکورہ اکیڈیمی کے دفتر ہی کی طرف سے بحث کی خاطر مقرر کیے گئے تھے۔ وہ پانچ موضوع یہ تھے:

- شخصی ملکیت کا جواز
- مصلحتِ عامہ کے تحت شخصی ملکیت کا خاتمہ

• فوجداری قانون میں نظریہ مسئولیت
• اجتہادی مذاہب کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا۔
• اسلام میں سود کا تصور

ان موضوعات پر تمام تقریریں فرانسیسی زبان میں ہوئیں اور ان میں فقہائے اسلام کی فقہی بحثوں کو نہایت خوبی سے عصری اسلوب میں پیش کیا گیا جنہوں نے شرکاء کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان میں سے ایک صاحب جو پیرس کی بار ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے تھے بے اختیار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولے:

"اب تک تو ہمارے سامنے یہ بیان کیا جاتا رہا ہے کہ فقہ اسلامی ایک جامد شے ہے، اس کے اندر کسی ایسے قانون کا ماخذ بننے کی صلاحیت نہیں ہے جو جدید سوسائٹی کی تبدیل ضروریات کو پورا کر سکے۔ مگر اب ہم ان تقریروں اور بحثوں میں جن خیالات کو سن رہے ہیں وہ اپنے دلائل کے لحاظ سے پہلے خیال کی صاف نفی کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان دونوں خیالوں کو کس طرح باہم تطبیق دوں۔"

یہ قانون دان گویا اپنے تمام ساتھیوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر تمام شرکاء اس رائے پر متفق ہوئے کہ "قانون" کو اسلامی فقہ سے ضرور مستفید ہونا چاہیے۔ بلکہ انہوں نے فقہ اسلامی کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہوئے بالاتفاق یہ قرارداد پاس کی:

"ہفتہ فقہ اسلامی کے دوران جن فقہی مضامین کو پیش کیا گیا ہے اور ان پر جو بحثیں کی گئی ہیں ان سے مختصر طور پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ:

ا۔ فقہ اسلامی کے اصول و مبادی بلاشبہ تشریعی اور قانونی قدر و قیمت (LEGAL VALUE) رکھتے ہیں۔

ب۔ قانونِ اسلامی کے اس بیش بہا ذخیرہ میں مختلف مذاہب فقہیہ کے باہمی اختلافات اپنے دامن میں قانونی معلومات اور اصولِ قانون کی حیرت انگیز دولت سمیٹے ہوئے

ہیں جن کی مدد سے فقہ اسلامی آج بھی عہدِ حاضر کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا فوائد کی بنیاد پر شرکائے مؤتمر کی خواہش ہے کہ ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو فقۂ اسلامی کی ایک ایسی قاموس تیار کرے جو فقہی تالیفات کی طرف رجوع کرنے کا راستہ آسان کر دے اس کی صورت فقہی انسائیکلوپیڈیا کی ہو جس میں قانونِ اسلامی سے متعلق پورے مواد کو بطرزِ جدید پیش کیا گیا ہو۔"

اس تجویز کے حق میں یہ پہلی آواز نہیں اٹھی ہے بلکہ اس سے قبل خود مسلمانوں کے اندر سے بعض محققین اور ماہرینِ فقہ بھی اس طرح کی تجاویز پیش کر چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف مقامات سے اس طرح کی آوازوں کا اٹھنا اس امر کی دلیل ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوینِ جدید ہمہ گیر طور پر ایک ناگزیر ضرورت اور بین الاقوامی خواہش بن چکی ہے۔ ایک طرف اسلام کا یہ غیر فانی سرمایۂ قانون ہے جو کتبِ فقہ کے اوراق میں منتشر لیکن بالکل گمنامی کی شکل میں پڑا ہے حتیٰ کہ بڑی بڑی لیجسلیچروں اور ائمۂ قانون کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے۔ اور دوسری جانب قانون کے تقابلی مطالعہ و تحقیق پر جو کام ہو رہا ہے اس میں فقہ اسلامی کو وہ حیثیت نہیں دی جا رہی جس کی وہ مستحق ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں جس قدر قانون سازی ہو رہی ہے اس کا بیشتر حصہ فقہ اسلامی کی بنیادوں سے ہٹا ہوا ہے[1] اور اگر کچھ اربابِ تحقیق فقہ اسلامی سے استفادہ کے لیے کتابوں کو ہاتھ لگاتے ہیں تو اکثر حالات میں بجز محنت و مشقت انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا اور وہ بالآخر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں

شریعت کالج دمشق، کا قابلِ قدر اقدام

مذکورۂ بالا کانفرنس کی قرارداد کو طویل عرصہ گذر چکا ہے، لیکن آج تک کسی بھی عرب حکومت نے، اور بالخصوص ان حکومتوں نے جنہوں نے اپنے مندوبین بھیج کر اس مؤتمر

[1] یہ اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ شام کے دستور میں باقاعدہ یہ تصریح موجود ہے کہ قانون سازی کا ماخذ اسلامی شریعت ہوگی۔ لیکن اسلامی شریعت کو مکمل طور پر ہر پہلو سے ملکی قانون سازی پر غالب نہیں کیا گیا۔ شام کے اہلِ علم حضرات کی جانب سے اسلامی شریعت کے کلی نفاذ کے لیے پوری کوشش ہو رہی تھی کہ مصر و شام کا اتحاد وجود میں آ گیا اور شام کا مستقل دستور منسوخ کر دیا گیا اور اس کے بجائے متحدہ جمہوریہ کے دونوں حصوں میں ایک عارضی دستور نافذ کر دیا گیا جو تا حال جاری ہے (مترجم)

میں حصہ لیا تھا، اس بارے میں مستعدی کا اظہار نہیں کیا اور نہ کسی یونیورسٹی یا اکیڈیمی ہی کے اندر اس آرزو کو بر لانے کی تحریک پیدا ہوئی۔

شریعت کالج (شام یونیورسٹی) کی تاسیس ۱۹۵۵ء میں ہوئی ہے۔ یہ نومولود کالج اپنی طرز تعلیم اور اپنے تدریسی ماحول کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ اور اس کے سامنے جس دشوار گزار مہم کو سر کرنے کا پروگرام ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم و تدریس میں منہمک رہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس کالج نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر فقہی انسائیکلوپیڈیا کی تالیف کا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہے۔ اور اسے یقین ہے کہ اس کام کے ذریعے وہ تہذیب و علم اور فقہ کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے گا۔

اس سلسلے میں شریعت کالج نے آغازِ کار میں جو سعی و جہد کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

سب سے پہلے انسائیکلوپیڈیا کی تالیف و اشاعت کے بارے میں ایک جامع اسکیم تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل کی گئی تاکہ کام کو نظم و نسق کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے اور حکومت کی تائید اور مالی امداد بھی حاصل کر لی جائے۔ کمیٹی نے اپنے متعدد اجلاسوں میں تبادلۂ خیال کرنے کے بعد اور مختلف طریقہ ہائے کار کا جائزہ لینے کے بعد ایک اسکیم مرتب کی۔ ۳ مئی ۱۹۵۶ء کو حکومتِ شام نے ایک فرمان کے ذریعے اس اسکیم کی منظوری دے دی۔ اس میں یہ واضح کر دیا گیا کہ شریعت کالج فقہی علوم کی ایک انسائیکلوپیڈیا مدون کرے جس میں مسلمانوں کے تمام مذاہب کی فقہ کے مباحث کو شامل کیا جائے اور اُسے مروجہ قانونی انسائیکلوپیڈیا کے ڈھنگ پر اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس میں اسلامی فقہ کو جدید سائنٹفک انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ ہر موضوع میں فقہ اسلامی کی طرف رجوع کرنا انتہائی حد تک آسان کر دیا گیا ہو، اور اہلِ تحقیق کے لیے فقہ کے اصل مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ ایک بہترین گائیڈ کا کام دے۔ نیز اسکیم میں "فقہی انسائیکلوپیڈیا کمیٹی" کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا جو انسائیکلوپیڈیا کی تالیف کے بنیادی خطوط مرتب کرے۔ اس حکم کے مطابق شام یونیورسٹی کے سینٹ نے شریعت کالج کی تجویز کی روشنی میں مندرجہ ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی نامزد کی:

(۱) ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی سابق پرنسپل شریعت کالج شام ۔ (۲) ڈاکٹر احمد السمّان پرنسپل لا کالج شام ۔
(۳) پروفیسر مصطفیٰ زرقا استاذ سول لا و قانونِ اسلامی لا کالج شام (۴) ڈاکٹر معروف الدوالیبی ایل ایل ڈی (پیرس یونیورسٹی)، استاذ قانون اسلامی شریعت کالج شام (۵) ڈاکٹر یوسف العش۔[1]

اس کمیٹی نے متعدد اجلاس منعقد کیے، موجودہ تمام قانونی دائرہ ہائے معارف (ENCYCLO-PEDIAS OF LOW) کے سسٹم اور اسالیب کا مطالعہ کیا اور فقہ کے مباحث و ابواب سے ان کا موازنہ کیا۔ مشہور و معروف قانون دانوں اور علمائے فقہ سے ربط قائم کیا۔ اور طویل بحث و تمحیص کے بعد کام کے مرحلۂ اوّل کیلئے ذیل کے دو پروگرام بروئے عمل لانے کا فیصلہ کیا:

۱- جن موضوعات کو انسائیکلو پیڈیا میں درج کیا جائے ان کو یک لفظی عنوان کے تحت معین کیا جائے۔ یہ موضوعات فقہ اسلامی کے مروّجہ ابواب تک محدود نہ رکھے جائیں بلکہ جزئی مباحث کے لیے بھی مستقل عنوانات رکھے جائیں تاکہ انسائیکلو پیڈیا کی طرف رجوع کرنے والا جس خاص مضمون کا طلبگار ہو اُسے اپنی جگہ پر ایک مستقل اور جداگانہ مقالے کی صورت میں پائے۔

۲- فقہ کی قابلِ اعتماد اُمّہاتِ کتب کے موضوعات کی ایک فہرست تیار کی جائے جو حروفِ تہجّی کی ترتیب پر ہو، تاکہ اس دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کی تحریر میں حصہ لینے والوں کو مطلوبہ مواد کی جانب رہنمائی مل سکے اور کتبِ فقہ میں جہاں جہاں کسی موضوع سے متعلق کلام کیا گیا ہے ان مقامات کی نشاندہی بآسانی ہو جائے۔ اس نوعیت کا انڈکس بن جانے سے خود انسائیکلو پیڈیا کے عنوانات کی فہرست بھی بڑی سہولت سے مرتب ہو جائیگی۔

اس انڈکس کی تیاری کے سلسلے میں انسائیکلو پیڈیا کمیٹی نے فقہ کی اُمّہاتِ کتب کا جائزہ لیا اور ان میں سے ایک نہایت عمدہ کتاب "المحلّٰی" کا انتخاب کیا۔ یہ کتاب علامہ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ)

---

[1] ۱۹ اپریل ۱۹۵۹ء کو ایک فیصلہ کی رو سے ڈاکٹر محمد زکی عبدالبر اور پروفیسر منتصر الکتانی کو بھی کمیٹی کا ممبر نامزد کر دیا گیا۔ لا کالج اور شریعت کالج کے پرنسپل اپنے عہدے کے اختیار سے اس کمیٹی کے ممبر اور شام یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر حکمت ہاشم اس کے اعزازی صدر مقرر کیے گئے۔

کی تالیف ہے اور فقہی مضامین کا نہایت جامع مجموعہ ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فقہی اصطلاحات کے مفہوم اور حدود کو بڑی وضاحت کے ساتھ متعین کیا گیا ہے اور ان کے نازک سے نازک فرق ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ موضوعات کی فہرست مرتب کرنے میں یہ کتاب ہمیں شاہ کلید کا کام دے سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک ایسے عالم کی خدمات میسر آگئیں جو اس کتاب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور وہ ہمارے شریعت کالج کے ایک پروفیسر استاذ منتصر الکتانی ہیں۔ کمیٹی نے اس کتاب کے تفصیلی انڈکس کا کام موصوف کے سپرد کیا تھا۔ انھوں نے دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک نہایت کامیاب انڈکس تیار کر دیا جسے المحلّٰی کا خلاصہ کہنا درست ہوگا۔ انڈکس کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ کر دی گئی ہے۔ اور وہ فقہ کے پورے الفاظ و اصطلاحات پر حاوی ہے۔ یہ انڈکس عنقریب شائع کر کے دائرۃ المعارف کے فاضل مصنفین تک پہنچا دیا جائے گا۔

اسی نوعیت کے انڈکس کے لیے ایک اور کتاب کمیٹی نے منتخب کر لی ہے۔ یہ کتاب حاشیہ ابن عابدین ہے جو فقہ حنفی کے تمام موضوعات و اجتہادات پر حاوی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کتاب مذہب حنفی کی تمام کتابوں کا ایک جامع ملخص ہے۔ کمیٹی اس کتاب کے انڈکس کو بھی قلیل مدت میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ممکنہ وسائل پر غور کر رہی ہے۔

اس جلیل القدر اسکیم کو روبعمل لانے کے لیے انسائیکلوپیڈیا کمیٹی نے ڈاکٹر محمد زکی عبدالبر سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ جو قاہرہ کی ابتدائی عدالت (COURT OF FIRST INSTANCE) کے مجسٹریٹ ہیں۔ موصوف ایک مدت سے جدید قانون اور فقہ اسلامی کے متقابل مطالعہ میں مشغول رہے ہیں اور انہیں اس انسائیکلوپیڈیا کی تجویز سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ کمیٹی کی درخواست پر حکومت مصر نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات شریعت کالج (دمشق) اور انسائیکلوپیڈیا کمیٹی کے حوالہ کر دیں اور دسمبر ۱۹۵۸ء میں انہوں نے دمشق منتقل ہو کر انسائیکلوپیڈیا کی پوری اسکیم کا خاکہ مرتب کرنا شروع کر دیا۔

اب ان کی رپورٹ کے مطابق آخری شکل میں جو اسکیم کمیٹی نے منظور کی ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

انسائیکلوپیڈیا کی غرض و غایت | انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کا مقصد یہ ہے کہ ہر مذہب کی فقہی

کتابوں میں جس قدر فقہی احکام کا ذخیرہ بکھرا پڑا ہے اُسے ایسے منظم طریقے سے جمع کر دیا جائے کہ محققین اور قانون ساز حضرات کے لیے فقہی مواد و مضامین سہل الحصول ہو جائیں اور فقہ کا وسیع تر مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس میں اصل ماخذ و مصادر کی رہنمائی موجود ہو۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نہ کوئی اجتہادی کوشش ہے اور نہ غیر اسلامی قوانین سے اسلامی قانون کا موازنہ پیشِ نظر ہے۔ بلکہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے اس کی غایت محض اب تک کے پورے فقہی مواد کو ایک نظم کے تحت لانا اور اس سے استفادے کو ہر لحاظ سے آسان بنانا ہے۔ طریقِ کار کے اس بنیادی قاعدے کی رُو سے یہ انسائیکلوپیڈیا مصنفین کے اپنے اجتہادات اور غیر اسلامی قوانین کے ساتھ فقہ اسلامی کے موازنے سے خالی ہو گی، اگرچہ خال خال مقامات اس سے مستثنیٰ بھی ہو سکتے ہیں۔

اس طرح سے یہ انسائیکلوپیڈیا اگلے قدم ـــــ یعنی جدید ضروریات پر فقہ اسلامی کو منطبق کرنے اور اسلامی ممالک میں اسے قانون سازی کا ماخذ بنانے ـــــ کے لیے بنیاد کا کام دے گی ان شاء اللہ۔

فقہی مذاہب مذکورہ مقصد کی رُو سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حتی الامکان انسائیکلوپیڈیا کا تمام فقہی مذاہب اور مدرسہ ہائے فکر پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ہمارا فقہی سرمایہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے اور نہ ہی صرف ایک مذہب ہمارے مختلف ممالک کی تشریعی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اس لیے لازم ہے کہ انسائیکلوپیڈیا میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مذاہب کے ساتھ دوسرے مذاہب مثلاً ظاہری، زیدی، امامی (اثنا عشری) اور اباضی (خارجی) بھی شامل کیے جائیں۔ البتہ غیر ضروری تکرار سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ کسی فقہی موضوع کو بیان کرنے کے لیے ایک مذہب کو بنیاد کے طور پر لیا جائے اور پھر اس مذہب اور دوسرے مذاہب کے مابین جو اختلافات ہوں اُن کو الگ الگ بیان کر دیا جائے۔

چونکہ ہمارے ملک (شام) کا عام مذہب فقہ حنفی پر قائم ہے اس لیے اولیٰ یہی ہے کہ قاعدۂ عام کی حیثیت سے اسے ہی اساسی مذہب قرار دیا جائے اور دوسرے مذاہب کی آراء کو اختلافی نوٹس کی صورت میں درج کر دیا جائے۔ لیکن اس کا یہ مدعا بھی نہیں ہے کہ کسی خاص موضوع میں اقتضائے

مبحث کے باوجود مذہب حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کو سرے سے بنیاد ہی نہیں قرار دیا جائیگا۔ مثلاً مذہب حنفی میں اگر کوئی مسئلہ مفصل نہیں ہے اور دوسرے کسی مذہب میں اس پر وسیع بحث کی گئی ہے اور بہتر یہ خیال کیا جائے کہ اس مسئلہ کو وسیع ترین حدود کے ساتھ پیش کیا جائے تو اس صورت میں اسی مذہب کو بنائے بحث بنایا جائے گا جو زیادہ مفصل ہے۔ اس کی مثال شروط عقود کا مسئلہ ہے۔ مذہب حنفی میں عقود کی شروط صحیحہ کا دائرہ دوسرے تمام مذاہب مثلاً حنبلیہ وغیرہ سے تنگ ہے۔ اب درست یہ ہوگا کہ حنبلی اجتہاد کو بنیاد بنا کر موضوع کو بیان کیا جائے اور دوسرے مذاہب کے اختلافی نکات الگ درج کر دیئے جائیں۔

طریقۂ تدوین | انسائیکلو پیڈیا فقہ اسلامی کے تمام ابواب: عبادات، معاملات، جنایات وغیرہ پر مشتمل ہوگی تاکہ یہ مجموعہ ہر لحاظ سے جامع اور ہمہ گیر ہو۔ مواد کی ترتیب کے سلسلے میں کئی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ کتاب کے کئی حصے ہوں اور عبادات، معاملات اور جنایات وغیرہ میں سے ہر ایک اس کے علیحدہ حصوں میں بیان کیے جائیں (جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ہوتے ہیں)۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مختلف ابواب فقہ کو مستقل اور الگ الگ اجزاء میں بیان کرنے کے بجائے پوری انسائیکلو پیڈیا کو جامع اور مشترک صورت میں مدوّن کیا جائے۔ اور کسی مضمون کو تلاش کرنے کے لیے فقہی باب یا موضوع کے بجائے فقہی اصطلاح کے پہلے حرف کی جانب رجوع کیا جائے مثلاً ابراء، اجارہ، استبراء، استحاضہ کے مسائل حرف الف میں درج ہوں اور حج، حد، حکم، حق حرف ح کے تحت مذکور ہوں۔ انسائیکلو پیڈیا کمیٹی نے دوسرے طریقے کو ترجیح دی ہے۔

ترتیب | (۱) دائرۃ المعارف کی تقسیم حروف تہجی کے مطابق ہوگی۔

(۲) ہر مضمون متعلقہ فقہی اصطلاح کے حرفِ اوّل کے تحت ملے گا۔ مثلاً اجارہ کا بیان حرف الف کے تحت بیع کا حرف ب اور صلوٰۃ کا حرف ص کے تحت درج ہوگا۔ ترتیب میں لفظ کے حرف اوّل اور پھر اس کے قریبی حرف کی رعایت مسلسل قائم رہے گی۔

(۳) چونکہ انسائیکلو پیڈیا احکام فقہ کا مجموعہ ہوگی، محض لغوی قاموس نہیں ہوگی اس لیے کسی

لفظ کے حرفِ اوّل کی تعیین میں اصل فقہی اصطلاح کا لحاظ ہوگا اس کے مادہ یا مصدر کا اعتبار نہ ہوگا۔ مثلاً "استصناع" کا بیان حرف صاد (جوکہ اس کے مصدر کا حرفِ اوّل ہے) کے بجائے حرف الف میں مذکور ہوگا۔ البتہ حسبِ ضرورت اور تسہیل مراجعت کی خاطر ایسے کلمات کو جن میں حروف زائدہ پائے جاتے ہوں اصل حرف کے تحت درج کر دیا جائے گا اور ساتھ ہی اصل لفظ کا حوالہ دے دیا جائے گا۔ مثلاً استصناع (جوکہ ایک فقہی اصطلاح ہے) کو اس کے اصل مادّہ "صنع" کے تحت حرف صاد میں ذکر کرکے اصل لفظ کا جو حرف الف کے تحت ہوگا حوالہ دے دیا جائے گا۔ وہاں ہی اس کے جملہ احکام و مسائل مندرج ہوں گے۔

(۴) ہر موضوع کے خاتمۂ بحث پر اس موضوع سے مشابہت یا قریبی تعلق رکھنے والے مضامین کا حوالہ دے دیا جائے گا۔ مثلاً "بیع" کے آخر میں "مقایضہ"، "سلم"، "صرف" وغیرہ کے مباحث کا حوالہ دے دیا جائے گا۔

تقسیم موضوعات | تمام موضوعات کو تین قسموں پر منقسم کیا جائے گا:

(۱) جامع موضوعات جیسے بیع وغیرہ (۲) ضمنی موضوعات۔ یہ موضوعات اگرچہ جامع موضوعات ہی میں داخل ہوں گے لیکن چونکہ ان کا اپنا ایک مستقل وجود بھی ہے اس لیے ان کے جداگانہ مباحث قائم کیے جائیں گے مثلاً مسئلہ خیار ہے۔ یہ ایک جامع موضوع "بیع" میں داخل ہے لیکن چونکہ یہ اپنی ذات میں بھی ایک مستقل موضوع ہے اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ اسے مستقل مادے کی شکل میں بیان کیا جائے۔ (۳) موادِ حوالہ۔ یہ مواد اگرچہ قسم اوّل اور قسم دوم میں ہی داخل ہے، لیکن قارئین کی سہولت کے لیے اسے الگ اپنے حرف کے تحت درج کر کے اصل مقام کی جانب راجع کر دیا جائے گا۔ مثلاً لفظ "ثمن" کو حرف میم میں درج کر کے "مبیع" کا حوالہ دے دیا جائے گا جہاں اس کی اصل بحث ہوگی (ثمن اور مبیع دونوں دراصل ایک ہی مضمون کے دو اصطلاحی نام ہیں)

کتب مآخذ | ہر فقہی بحث کے لیے مآخذ کی ایک فہرست تیار کی جائے گی۔ اس بحث کے مصنف کو کم ازکم ان مآخذ کی جانب رجوع کرنا لازمی ہوگا۔ کتابوں کے انتخاب میں اس امر کا پورا پورا

لحاظ رکھا جائے گا کہ وہ جامع، قابل اعتماد اور متنوع ہوں اور متعلقہ بحث کے لیے کم از کم ضروری حد تک مرجع بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ ان مآخذ کے اڈیشن بھی متعین کر دیئے جائیں گے تاکہ پورے دائرۃ المعارف میں وحدت و یگانگت قائم رہے۔

ہر موضوع کی ترتیب کا نظام | انسائیکلوپیڈیا کو منظم شکل میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ مصنفین اور مقالہ نگاروں کی تحریر اور ترتیبِ مواد میں ہم آہنگی ہو۔ چنانچہ اس کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ موضوع کی ابتدا میں چھوٹے حروف میں تمام نقاطِ بحث بیان کر دیئے جائیں جن میں پہلے مسائلِ عامہ کا ذکر ہو اور پھر ان کی فروعات کا۔ بعد میں ان تمام مصادر و مآخذ کا حوالہ دے دیا جائے جن کی طرف زیرِ ترتیب مقالہ میں رجوع کیا گیا ہو۔ حوالہ میں کتاب کے جز اور اڈیشن کے ذکر کا اہتمام ضروری ہے۔ اس ابتدائیہ کے بعد موضوع کی تفصیلات بیان کی جائیں۔ اثنائے بحث میں اگر کوئی ایسا ضمنی اور فرعی موضوع چھڑ جائے جس کی تفصیل انسائیکلوپیڈیا میں کسی دوسرے مقام پر بھی وارد ہوئی ہو تو اس کی جانب بھی اشارہ کر دیا جائے۔ خاتمۂ بحث پر موضوع سے ملتے جلتے موضوعات کی جانب توجہ دلا دی جائے۔

مبحث کی خاکہ بندی | چونکہ فقہ اسلامی کا مواد بلشتر مخلوط و متداخل صورت میں ہے اس لیے انسائیکلوپیڈیا کمیٹی بذاتِ خود یا اپنے ارکان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے یا کسی باہر کے اہلِ علم کی خدمات حاصل کر کے ہر موضوع کے لیے خطوطِ بحث تیار کروائے گی اور مقالہ نگار کو لکھنے کے پورے نقشۂ کار سے آگاہ کرے گی۔ بلکہ ہر موضوع کے مشابہ اور ضمنی و فرعی موضوعات کی بھی نشاندہی کر دے گی تاکہ مقالہ نگار پیشِ نظر بحث کی حدود کو پہچان سکے۔ اس سلسلے میں ہر مقالہ نگار بھی منصوبہ بندی کے بارے میں کمیٹی کو اپنی ترمیمی آراء سے اور تجاویز سے آگاہ کر سکتا ہے جنہیں وہ مناسب خیال کرتا ہے۔ خاص حالات میں کمیٹی بحث کی خاکہ بندی خود مقالہ نگار ہی کے سپرد کر سکتی ہے۔ اس صورت میں مقالہ نگار کو چاہیے کہ وہ پورا خاکہ کمیٹی کو بھیج دے۔ کمیٹی اُسے بعینہٖ یا ضروری ترمیم کے ساتھ منظور کر کے واپس بھیج دے گی

مقالہ نگار اس امر کا خاص خیال رکھے کہ اسلوب تحریر سلیس ہو اور لفظی تعقید سے خالی ہو بہتر یہ ہے کہ حتی الامکان کتب فقہ کی اصل عبارات کو استعمال کیا جائے۔ بشرطیکہ اس عبارت سے بلا تکلف مفہوم کی وضاحت ہوتی ہو۔ ایسی عبارت کو اپنے الفاظ میں قوسین کے اندر نقل کر کے اصل ماخذ کا حوالہ دے دیا جائے۔

کمیٹی کے اختیارات انسائیکلو پیڈیا کمیٹی کے پاس جس قدر لکھے ہوئے مقالات و مباحث آئیں گے وہ ان پر نظر ثانی کرے گی اور اسے کامل اختیار ہوگا کہ کسی مقالے کو مختصر کر سکے یا مناسب سمجھے تو اس میں حذف و اضافہ کر سکے۔ اس سے مقصد صرف انسائیکلو پیڈیا کے پورے مواد میں تنظیم و تنسیق ہے۔ جب تک یہ مقصد پیش نظر ہے کسی مقالہ نگار کی توہین و استخفاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پورے کام کے مراحل (۱) پہلا مرحلہ: اس مرحلہ میں فقہ اسلامی کے الفاظ و اصطلاحات جمع کیے جائیں گے۔ یہ الفاظ و اصطلاحات مذاہب اربعہ کی معروف کتابوں سے لیے جائیں گے۔ اس میں ہر مذہب کی ایک سے زائد کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرا مرحلہ: اس مرحلے میں جمع شدہ الفاظ و اصطلاحات کی روشنی میں مباحث کے خطوط واضح کیے جائیں گے۔ (یعنی ہر مقالہ کی علیحدہ علیحدہ خاکہ بندی ہوگی)

(۳) تیسرا مرحلہ۔ اس مرحلے میں مقررہ خاکوں کے مطابق مستند اہل علم و ارباب فضل سے مباحث لکھوائے جائیں گے۔

(۴) چوتھا مرحلہ: اس مرحلے میں کمیٹی تیار شدہ مباحث پر نظر ثانی کرے گی۔ اور ان کے اندر ہم آہنگی پیدا کر کے آخری شکل دے کر زیر طباعت مواد میں شامل کرے گی۔

اس وقت کمیٹی مرحلۂ اول کو عبور کر رہی ہے۔ اور اس نے الفاظ و اصطلاحات کی جمع و ترتیب کا کام ڈاکٹر محمد زکی عبدالبر کے سپرد کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر موصوف اپنے کام کا بیشتر حصہ ختم کر چکے ہیں۔

طباعت موجودہ زمانے میں انسائیکلو پیڈیا کی طرح کے مجموعوں کی اشاعت و طباعت کیلیے جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے اسی فقہی انسائیکلو پیڈیا کیلیے اسی جدید ترین اسلوب اختیار کیا جائیگا۔ مجمل طور پر ہماری رائے یہ ہے کہ تمام اجزاء اور

مجلدات، بڑے سائز پر، بحرف متوسط دو کالموں میں شائع کیے جائیں۔ یہ طرز قبل ازیں ڈیلوز انسائیکلو پیڈیا کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

اہلِ علم کا انتخاب کمیٹی ایسے تمام علماء اور ماہرین کے ناموں کا جائزہ لے رہی ہے جو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین میں شریک کیے جا سکتے ہیں اور کسی موضوع کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی انسائیکلو پیڈیا کی تالیف کسی ایک ملک کے اہلِ علم تک محدود نہیں رکھی جا سکتی۔ بلکہ اس میں تمام عالمِ اسلامی کے نادر و قابل اہلِ علم کی شرکت لازمی ہوگی اور ایک عالم کو ایک سے زائد موضوع کی تکلیف بھی دی جا سکتی ہے۔

واللہ ھو الموفق والھادی الی سواء السبیل

موجودہ نظامِ تعلیم کا اساسی تخیُّل

لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

(ذیل میں ہم مشہور قانون دان اور ماہرِ تعلیم لارڈ میکالے کی اس تاریخی یادداشت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو اس نے برعظیم ہند میں نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے لیے ۱۸۳۵ء میں اُس وقت کے گورنر جنرل کے سامنے پیش کی تھی۔ اِس وقت جبکہ مسئلۂ تعلیم ہمارے ملک کے تمام سوچنے والے افراد کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُن عزائم اور مقاصد کو اچھی طرح سمجھ لیں جن کو سامنے رکھ کر انگریزی سامراج نے ہمارے لیے موجودہ نظامِ تعلیم تجویز کیا تھا۔

ترجمہ میں اس بات کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ یہ اُس یادداشت کی آزاد ترجمانی نہ ہو بلکہ اُس کے انگریزی متن کو لفظ بلفظ اردو میں ڈھال دیا جائے (مترجم)۔)

مجلسِ تعلیماتِ عامہ میں جو حضرات شریک ہیں اُن میں سے بعض اصحاب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اب تک وہ جس طریقے پر عمل پیرا رہے ہیں، اُسے برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں قطعی طور پر متعین کر دیا تھا۔ اگر اس رائے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک مجلسِ قانون سازہی کوئی قانون پاس نہ کرے، نظامِ تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اندریں حالات میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن مخالفانہ بیانات کی ترتیب و تسوید میں حصہ لینے سے احتراز کروں جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں اور جو کچھ مجھے اس موضوع پر کہنا ہے اس کے لیے اس وقت کا

انتظار کروں جب یہ مسئلہ کونسل آف انڈیا کے ایک رکن کی حیثیت سے میرے سامنے پیش ہو۔

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی قانون کے اندر محض الفاظ کے الٹ پھیر سے وہ معانی کس طرح پیدا کیے جا سکتے ہیں جو اس وقت اس میں سے اخذ کیے جا رہے ہیں۔ اس میں اُن علوم اور زبانوں کا جو ہمیں پڑھانی مقصود ہیں کوئی ذکر تک نہیں ہے۔ اس میں تو محض اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ احیائے ادب، ہندوستانی فضلاء کی حوصلہ افزائی اور برطانوی علاقوں کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت نے ایک رقم مختص کر دی ہے۔ بعض لوگ منطقی استدلال سے اور بعض ایک بدیہی حقیقت سمجھتے ہوئے اس امر کے دعویدار ہیں کہ ادب سے پارلیمنٹ کی مراد عربی اور سنسکرت ادب ہی ہو سکتی ہے۔

وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستانی جو ملٹن کی شاعری، لاک کی الٰہیات، اور نیوٹن کی طبیعیات کا شناسا ہے اُسے "دیسی عالم" کے معزز لقب سے سرفراز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لقب تو انہی افراد کو زیب دیتا ہے جنہوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں کُشا گھاس کے مختلف استعمالات اور گیان کے اسرار و رموز پا لیے ہیں۔ میرے نزدیک اس قانون کی یہ تعبیر کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے میں اس سے ملتی جلتی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ پاشائے مصر — وہ مصر جو کبھی علم و فن کے اعتبار سے یورپین اقوام سے بھی ممیز اور ممتاز تھا مگر اب بہت پسماندہ ہے — ایک خاص رقم ادب کی توسیع و اشاعت اور وہاں کے علماء کی امداد کے لیے وقف کرتا ہے، تو کیا اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ پاشا کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس کی قلمرو میں رہنے والے نوجوان یا تو تصویری خطوط میں برسہا برس تک منہمک رہیں، یا اُن عقائد و نظریات میں اپنی صلاحیتیں کھپائیں جو اوسائرس کے قصّے کہانیوں میں گم ہیں یا ان مذہبی رسوم کی تلاش و جستجو میں قوتیں صرف کریں جن کی وساطت سے ماضی میں بلّی اور پیاز کے سامنے اظہار عقیدت کیا جاتا تھا۔ کیا آپ اسے تضاد سے تعبیر کریں گے؟ اگر وہ رقم نوجوانوں کو کاواک حروف متعین کرنے کی بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبان اور وہ سارے علوم جن کے

لیے یہ زبانیں کلید کی حیثیت رکھتی ہیں، سکھانے پر صرف کی جائے؟[1]

قدیم نظام کے حامی جن الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اُن سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا، بلکہ ان کے بعد جو الفاظ موجود ہیں اُن سے قطعی اور حتمی طور پر اس کے بالکل برعکس نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ایک لاکھ کی رقم ہندوستان میں صرف احیائے ادب کے لیے ہی مختص نہیں کی گئی (اگرچہ اس نظریہ کے حامی سارا زور اسی جملہ پر صرف کر رہے ہیں) بلکہ اس کا مقصد انگریزی علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں مختلف علوم و فنون کی ترویج و ترقی ہے۔ ان الفاظ میں اُن تمام تبدیلیوں کے لیے وجہ جواز موجود ہے جن کے لیے میں پیہم کوشش کر رہا ہوں۔ اگر کونسل میری اس تعبیر سے متفق ہو تو پھر کسی نئے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اگر وہ اس امر میں مجھ سے اختلاف کرے تو پھر میں ایک ایسے مختصر قانون کا مسودہ تیار کروں گا جو ۱۸۱۳ء کے منشور کی اس بندش کو جو اس راہ کا سنگِ گراں ہے، کالعدم کر دیگا۔

میں جس زاویۂ نگاہ سے بحث کر رہا ہوں اس کا تعلق طریق کار سے ہے۔ مگر مشرقی طرز تعلیم کے پرستار اس معاملہ کو بالکل دوسری نہج پر سوچتے ہیں۔ اگر اُن کے استدلال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ عوام کا اعتماد اسی

[1] میکالے صاحب کا یہ منطقی مغالطہ قابلِ غور ہے۔ وہ دراصل چاہتے یہ تھے کہ کمپنی بہادر نے جو رقم احیائے علوم کے لیے مختص کی تھی اسے عربی اور سنسکرت کتابوں کی اشاعت اور ان زبانوں کی تعلیم پر صرف کرنا بند کر دیا جائے اور انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے وہ استدلال پیش کیا ہے جو اوپر آپ دیکھ رہے ہیں۔ گویا پاشائے مصر اگر کوئی رقم اس مقصد کے لیے مختص کرے تو اس کے دو ہی مصرف ممکن ہیں۔ یا تو تین چار ہزار برس پہلے کی مصری تہذیب کے مطالعہ پر اسے صرف کیا جائے، یا پھر انگریزی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم پر۔ رہی تیسری صورت کہ خود پاشا کے اپنے زمانے کی عربی زبان اور اس کے علوم پر اسے صرف کیا جائے، یہ میکالے صاحب کے نزدیک خارج از بحث تھی۔

نظامِ تعلیم کو حاصل ہے جو اِس وقت ملک میں رائج ہے۔ اس لیے اگر اُس فنڈ کو جو ابھی تک صرف عربی اور سنسکرت کی توسیع و اشاعت پر خرچ ہوتا رہا ہے کسی اور مصرف میں استعمال کیا جائے تو ہمارا یہ فعل خالص تصرفِ بیجا کے مترادف ہو گا۔ میری سمجھ میں یہ چیز ابھی تک نہیں آئی کہ وہ کس منطق کی رو سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ سرکاری خزانہ سے جو مالی امداد ادب کی ترقی کے لیے عام طور پر دی جاتی ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے اُن اعانتوں سے بالکل مختلف نہیں ہے جو حکومت رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے دیتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم نے ایک مقام کو صحت کے نقطۂ نظر سے موزوں سمجھتے ہوئے وہاں ایک صحت گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے اس فیصلے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر ہمیں متوقع نتائج نہ بھی حاصل ہوں تب بھی ہم اس صحت گاہ کو اسی مقام پر قائم رکھنے کے لیے اصرار کرتے رہیں۔ یا مثلاً ہم ایک بند کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔ کیا ہمارا یہ فعل دیانت کے خلاف ہو گا اگر ہم ایک مرحلہ پر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کام کی کوئی افادیت نہیں ہے، اس کی تعمیر روک دیں؟ ملکیت کے حقوق بلاشبہ بڑے مقدس اور واجب الاحترام ہیں، مگر ان حقوق کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بالعموم ان کے تحت ایسی چیزوں کو خواہ مخواہ کھینچ لاتے ہیں جو فی الواقع اُن کے حدود میں نہیں آسکتیں۔ جو لوگ غلط استعمالات و تصرفات کو حقوق ملکیت کی حرمت کے نام پر جائز ٹھیراتے ہیں وہ درحقیقت ملکیت کے اصول کو اس ذلت اور بدنامی کے خطرے میں مبتلا کر دیتے ہیں جو درحقیقت غلط تصرفات کے لیے مقدر رہے۔ اگر حکومت نے کسی فرد کو یہ یقین دلایا ہو، یا اور کچھ نہیں تو اس نے اپنے کسی قول یا فعل سے کسی شخص کے ذہن میں بجا طور پر یہ توقع ہی پیدا کر دی ہو کہ وہ سنسکرت یا عربی کے استاد یا طالب علم کی حیثیت سے ایک خاص مشاہرہ پائیگا تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اس شخص کے مالی مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کروں۔ میں تو یہاں تک جانے کے لیے بھی تیار ہوں کہ عوامی اعتماد کو قائم رکھنے کی خاطر جہاں تک ممکن ہو افراد کے ساتھ فیاضی برتی جائے خواہ وہ فیاضی غلط ہی کیوں نہ ہو مگر اس بات کا دعویٰ کرنا مجھے تو

بالکل بے معنی نظر آتا ہے کہ حکومت نے بعض ایسی زبانوں اور ایسے علوم کی سرپرستی کا ذمہ لیا ہے جو فضول اور ناکارہ ہیں[1]۔

تعلیماتِ عامہ کے آئین و ضوابط میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی عہد وپیمان باندھا ہے۔ یا یہ رقم جن مقاصد کے لیے وقف کی گئی ہے وہ مقاصد بالکل لگے بندھے اور غیر متبدل ہیں۔ تاہم اگر یہ چیز موجود بھی ہوتی تب بھی میں اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ہمارے آبا واجداد ہمیں کسی ایسے معاہدے کا پابند کرنے کے مجاز تھے۔ فرض کیجیے کہ گزشتہ صدی میں کار پردازانِ سلطنت پوری سنجیدگی سے یہ قانون وضع کر گئے ہوتے کہ رعایا کو ابدالآباد تک اسی طریقہ سے چیچک کے ٹیکے لگوائے جائیں جو اُن کے عہد میں رائج تھا تو کیا اب جینر JENNER کے جدید انکشاف کے بعد حکومت کا اُس طریقہ پر اصرار کرنا مناسب ہوگا؟ یہ مواعید جن کی تعمیل یا انجام وہی کی ذمہ داری نہ کسی فردِ واحد پر عائد ہوتی ہے اور نہ جن کی پابندی سے کوئی کسی کو آزاد کرسکتا ہے، یہ مستقل حقوق جو درحقیقت کسی کو بھی بالاستقلال حاصل نہیں ہوتے، یہ عجیب ملکیت جس کا فی الواقع کوئی مالک نہیں، یہ نرالی چوری جس میں کسی کا مال بھی چرایا نہیں جاتا، ممکن ہے مجھ سے اعلیٰ اور ارفع دماغ کے لوگ ان باتوں کو سمجھ سکتے ہوں لیکن میرے ذہن کی رسائی سے تو بہرحال یہ ماورا ہیں۔ میرے نزدیک استدلال کا یہ طریق محض الفاظ کی بازیگری ہے جس کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں ہر اُس غلط کارروائی کی بالالتزام مدافعت کی جاتی ہے جس کے لیے اور کوئی وجہ جواز نہیں ہوسکتی[2]۔

---

[1] میکالے کا یہ استدلال اس مفروضے پر مبنی تھا کہ عربی اور سنسکرت بیکار زبانیں ہیں اور ان کے سب علوم فضول ہیں۔

[2] یہاں پھر میکالے نے محض تشکرِ لفظی کے بل پر سخت مغالطہ دیا ہے۔ فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اگر یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اسی سے وصول کردہ ٹیکسوں کا ایک حصہ اس کی زبان اور اس کے علوم کی ترقی پر صرف کرے گی تو اس وعدے سے وہ ان دلیلوں کی بنا پر کیسے سبکدوش ہوسکتی تھی جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اور اس وعدے کو آخر چیچک کے ٹیکوں والی مثال سے کیسے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔ کیا محکوم قوم کی زبان اور علوم کو ترقی دینے کا م

میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ایک لاکھ کی رقم بالکل گورنر جنرل باجلاس کونسل کی مرضی پر موقوف ہے اور ہندوستان میں علم کی ترقی کے لیے وہ جس طرح بھی مناسب سمجھیں اسے صرف کرنے کے پوری طرح مجاز ہیں۔ وہ جس طرح اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ میسور میں شیر مارنے والوں کا انعام گھٹا دیں، یا معابد میں زرِ مرمت پر آئندہ کوئی رقم صرف نہ کریں، بالکل اسی طرح انہیں یہ فیصلہ کر دینے کا بھی پورا اختیار ہے کہ جو رقم عربی اور سنسکرت کی سرپرستی کے لیے صرف کی جارہی ہے، اُسے اب اس مصرف میں نہ لایا جائے۔

اب میں معاملے کے اصل پہلو کو لیتا ہوں۔ ہمارے پاس ایک رقم ہے جسے حکومت کے فرمان کے مطابق اس ملک کے باشندوں کی علمی ترقی پر صرف کرنا مقصود ہے۔ اب سادہ سا سوال یہ ہے کہ اس رقم کا بہترین مصرف کیا ہوسکتا ہے؟

تمام طبقے (یعنی حکمران قوم کے طبقے) اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے اس حصہ کے رہنے والے جو مختلف بولیاں بولتے ہیں وہ ادبی اور علمی معلومات سے یکسر تہی دامن ہیں۔ پھر اُن کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم اور اندازِ بیان اس حد تک ناتراشیدہ ہے کہ جب تک انہیں کسی اور ذریعہ سے وسیع نہ کر دیا جائے، ان میں کسی قابلِ قدر علمی کام کو منتقل نہیں کیا جاسکتا[1]۔ یہ چیز اب ایک

ء مفہوم لازماً یہی ہوسکتا تھا کہ محض ان کے قدیم علوم کی اشاعت کی جائے اور ان میں نئے علوم منتقل کرنے کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا؛

[1] یہ پہلا مفروضہ ہی سراسر غلط تھا جس پر میکالے نے اپنے استدلال کی پوری عمارت اٹھائی تھی۔ اس کے قریب زمانے ہی میں حیدرآباد کے شمس الامراء اور بعض دوسرے لوگوں نے ریاضی اور فلکیات اور دوسرے سائنٹفک علوم پر اردو زبان میں کتابیں شائع کرکے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ زبان ہر قسم کے علمی مضامین ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر اس کے تھوڑی مدت بعد ہی ڈپٹی نذیر احمد نے تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کرکے یہ ثابت کر دیا کہ قانون کے باریک سے باریک مسائل بھی اردو زبان میں بخوبی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ مگر انگریز اپنے جھوٹے ترفع اور تعصب کی بنا پر یہاں کی زبانوں کو حقیر سمجھتے تھے اور ان کے ناکارہ ہونے

بدیہی حقیقت کے طور پر سامنے آچکی ہے کہ اس ملک کے جو طبقے اعلیٰ تعلیم پانے کے وسائل رکھتے ہیں اُن کا ذہنی نشوونما دیسی زبانوں کے سوا کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے[1]

وہ زبان کونسی ہو سکتی ہے؟ کمیٹی کے نصف ارکان کی رائے ہیں یہ زبان صرف انگریزی ہے۔ باقی اس مقام پر عربی اور سنسکرت کو فائز کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس امر کی چھان پھٹک کی جائے کہ کونسی زبان تعلیم و تعلّم کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

مجھے نہ تو عربی سے کوئی واقفیت ہے اور نہ سنسکرت[2] ہی سے۔ مگر ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے میں جو کچھ کر سکتا تھا اُس میں کوئی کسر میں نے نہیں اٹھا رکھی۔ مَیں نے عربی اور سنسکرت

م۔ پر متفق تھے تو یہ اس فیصلے کے لیے کوئی معقول دلیل نہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کے لیے ان کی مادری زبان کے بجائے ان کے حکمرانوں کی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ بعد میں حیدرآباد کی جامعۂ عثمانیہ کے تجربے کو جو شخص بھی دیکھے گا اس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ میکالے نے یہ الفاظ لکھ کر دراصل اُس وقت کے لوگوں کو ایک شرمناک دھوکا دیا تھا۔ میکالے کے زمانے کی اُردو اُس دور کی انگریزی سے بدرجہا بہتر حالت میں تھی جبکہ لاطینی اور یونانی کے سوا یورپ کی کسی زبان میں بھی کوئی علمی سرمایہ نہ تھا۔ اگر اُس وقت میکالے کا استدلال اس کے حق میں استعمال کیا جاتا تو آج انگریزی زبان کسی شمار میں نہ ہوتی۔

[1] قارئین کرام کو اس پوری تقریر میں اس قسم کے فقرات بکثرت ملیں گے جن سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو نیا نظامِ تعلیم ہم رائج کر رہے ہیں اس سے ہمارا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ اسی ملک کے رہنے والوں کی خواہش اور مفاد کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا ہے۔ اِس سرزمین کے ہر فرد نے پوری طرح یہ محسوس کر لیا ہے کہ وہ سارے علوم و فنون جو اُسے اسلاف سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں وہ بالکل عبث اور بیکار ہیں اور انگریز فرمانروا ان سے جتنی جلدی اس کا پیچھا چھڑا دیں اتنا ہی بہتر ہے۔ پھر ذہنی نشوونما سے میکالے کی مراد یہ ہے کہ یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جائے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے خالص انگریز ہو۔ جیسا کہ آگے چل کر خود اُس نے واضح کر دیا ہے۔

[2] صاحب کی جسارت کی داد دیجیے کہ وہ بغیر واقفیت کے

کی مشہور و معروف کتابوں کے تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے اُن لوگوں سے بھی، جنہیں ان مشرقی زبانوں پر دسترس حاصل ہے ــــ خواہ وہ اس ملک کے رہنے والے ہوں یا انگلستان کے ــــ تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ میں اس بات پر بھی تیار ہوں کہ مستشرقین جو اہمیت ان علوم کو دیتے ہیں وہی میں بھی دوں گا۱۔ ان حضرات میں مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی محض ایک الماری ہندوستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے۲۔ مغربی ادب کی حقیقی فوقیت اور برتری کا کمیٹی کے اُن ارکان نے بھی اعتراف

۴۔ کسی زبان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۱؎ یہ مستشرقین جن کی رائے کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے حاکم قوم کے ہی افراد ہیں۔ وہ مشرقی علوم سے کسی حد تک واقف تو ضرور ہیں مگر غلام قوم اور اُن کے علمی سرمایہ کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر بالکل وہی ہے جو دوسرے انگریزوں کا ہے۔ پھر مستشرقین کے جو علمی کارنامے بھی ہمارے سامنے آئے ہیں انہیں دیکھ کر نہ تو ہمیں اُن کے علم کے بارے میں کوئی حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی نیت بخیر معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی ساری کوششیں زیادہ تر ہماری تہذیب اور تاریخ کے بارے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے پر مرکوز رہی ہیں اور یہی ان کے نزدیک قومی خدمت اور علمی کارنامہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج ہمارے اندر جس قدر ذہنی خلفشار موجود ہے اس میں ان حضرات کی "خدماتِ جلیلہ" کا بہت بڑا حصہ ہے۔

۲؎ میکالے صاحب اپنے علم و فضل کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے کہ ایک قوم کے زمانۂ شباب کو دوسری قوم کے دورِ انحطاط کے بالمقابل رکھ کر ان دونوں کا موازنہ کرنا عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ مسلمان بھی کبھی دنیا کی ایک اقبالمند قوم تھی اور اس نے اپنے دورِ عروج میں جس قدر حیرت انگیز ترقی کی اس کا اعتراف خود میکالے کے ہم مشرب بھی کرتے رہے ہیں۔ یہاں ہم چند اقتباسات درج کرتے ہیں:۔

○ ہماری سائنس پر عربوں کا جو احسان ہے وہ صرف چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی زیادہ عربی ثقافت کی ممنونِ احسان ہے۔

کیا ہے جو مشرقی نظامِ تعلیم کے حق میں ہیں۔

۴۔ کیونکہ دراصل سائنس کو اسی ثقافت نے جنم دیا ہے۔ دنیائے قدیم قبل سائنس کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات و ریاضیات باہر سے درآمد ہوئی تھیں۔ چنانچہ یونانی ثقافت انہیں پورے طور پر کبھی جذب نہ کر سکی۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے علوم کو مرتب کرتے تھے عمومیت دیتے تھے۔ نظریات قائم کرتے تھے لیکن صابرانہ تحقیق و تفتیش۔ مثبت علم کی فراہمی۔ سائنس کی باریک بینی، مفصل و طویل مشاہدات اور تجربی تجسس۔ یہ سب لوازمِ علمی یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھے۔ قدیم کلاسیکی دنیا میں صرف پہلانی اسکندریہ کے اندر سائنسی عمل کی سعی کا سراغ ملتا ہے۔ ہم جس چیز کو سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ان امور کا نتیجہ ہے کہ تحقیق کی نئی روح پیدا ہو گئی۔ تفتیش کے نئے طریقے معلوم کیے گئے۔ تجربے، مشاہدے اور پیمائش کے اسلوب اختیار کیے گئے۔ ریاضیات کو ترقی دی گئی اور یہ سب کچھ ایسی شکل میں رونما ہوا جس سے یونانی بالکل بے خبر تھے۔ دنیائے یورپ میں اس روح کو اور ان اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔" (تشکیل انسانیت از رابرٹ بریفالٹ ص ۲۰۲)

۵۔ وہ مسائل جو مسلم فلاسفہ کو درپیش تھے وہ مغربی مفکرین کو بھی برابر پریشان کرتے رہے۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ مسلم فلاسفہ کا اندازِ بحث بڑا علمی تھا مگر انہوں نے کبھی بھی اپنی تحقیقات کو مذہبی اعتقادات پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ عیسائی فلاسفہ کی یہ ترقی فارابی، ابن سینا، غزالی اور ابن رشد کے افکار و نظریات کی رہینِ منت ہے۔" (اسلام اور عرب از روم لانڈو)

۶۔ جب مغرب ابن رشد کو پہنچا اور اس نے گہرے علم کے لیے پیاس محسوس کی جب اس کے اندر پرانے افکار سے شناسائی پیدا کرنے کا احساس پیدا ہوا تو اس نے سب سے پہلے یونانی ماخذ کی طرف نہیں بلکہ عربی ماخذ کی طرف توجہ کی۔ (مقدمہ تاریخ سائنس جارج سارٹن)

یہ امر قریب قریب متفق علیہ ہے کہ مشرقی ادب میں سب سے نمایاں مقام شاعری کو حاصل ہے۔ میری آج تک کسی ایسے مستشرق سے ملاقات نہیں ہوئی جو اس بات کا دعویدار ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کو یورپین شاعری کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم اُن تخلیقات کے دائرہ سے باہر نکل کر جن کا محور محض تخیل ہے اُن علوم کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں، جن میں تجربہ و مشاہدہ بطور اساس کام کرتے ہیں تو اس وقت یورپ کی فضیلت مسلّم ہو جاتی ہے۔ میرے اس دعوے میں مبالغہ کا قطعاً کوئی شائبہ نہ ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ وہ سارا تاریخی مواد جو سنسکرت کی کتابوں سے اکٹھا کیا گیا ہے، اندر قیمت کے اعتبار سے اُس مواد سے کہیں کم ہے جو انگلستان کے ابتدائی درجوں کے معمولی ملخصات میں موجود ہے۔ علم طبیعیات یا علم الاخلاق کے ہر شعبہ میں ان دونوں قوموں کے مابین تفاوت کا تناسب قریب قریب یہی ہے۔

پھر اصل صورتِ حال کیا ہوئی؟ ہمیں ایسے لوگوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے جنہیں فی الحال ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے ہمیں لامحالہ انہیں غیر ملکی زبان ہی سکھانی ہوگی۔ اس سلسلہ میں جو استحقاق ہماری اپنی زبان کو حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں یہ ایک امتیاز کی حامل ہے۔ اس میں شاعری کا ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے جو حسنِ تخیل کے لحاظ سے اس سرمایہ سے کسی طرح فروتر نہیں جو ہمیں یونان سے ورثہ میں ملا ہے۔ فصاحت، طلاقت اور خطابت کے جو اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے ہو سکتے ہیں وہ سارے اس میں موجود ہیں۔ اس کے اندر جو تاریخی داستانیں بکھری پڑی ہیں کوئی دوسری زبان اُن کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی تاریخ ایک اخلاقی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے عدیم المثال ہے۔ اس میں انسانی زندگی اور انسانی فطرت کی نہایت صحیح اور دلفریب عکاسی پائی جاتی ہے۔ پھر اس میں اخلاقی، سیاسی، فقہی، تجارتی اور مابعد الطبیعی مسائل پر نہایت ادق بحثیں بھی ملتی ہیں۔

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ سابق)۔ واضح رہے کہ کمیٹی کے سارے ارکان انگریز تھے۔ مشرقی نظامِ تعلیم کی حمایت جو اصحاب کر رہے تھے ان میں کوئی ہندوستانی نہ تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس میں ہر تجرباتی علم کے متعلق مکمل اور صحیح حقائق کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جس کے ذریعہ صحت کی حفاظت، نوعِ بشری کے آرام و آسائش اور انسانی عقل و خرد کو جِلا دینے میں انسان کو اچھی خاصی مدد ملی ہے۔ جو شخص اس زبان سے واقف ہے وہ اُس سارے علمی سرمایہ تک فوری دسترس رکھتا ہے جو دنیا کی دانشمند قوموں نے گزشتہ نو سو صدیوں میں اکٹھا کیا ہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ انگریزی ادب کو اُس سارے ادبی سرمایہ پر نمایاں فوقیت حاصل ہے جسے دنیا کی مختلف قوموں نے آج سے تین سو برس پیشتر تخلیق کیا تھا۔ یہی نہیں انگریزی زبان ہندوستان کے حکمراں طبقے کی زبان ہے[1]۔ اس ملک کے جو اونچے طبقے حکومت کے مراکز میں رہتے ہیں وہ بھی اسی زبان کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے ہیں اور مستقبل قریب میں مشرقی سمندروں میں تجارت بھی اسی زبان کی وساطت سے کی جائیگی۔ پھر یہ دو ایسی ابھرتی ہوئی قوموں کی زبان ہے جو جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا میں نشوونما پا رہی ہیں اور ہندوستان سے اُن کا رابطہ دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اب خواہ ہم اس زبان کے ذاتی اوصاف کی بنا پر یا ملک کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر کوئی قدم اٹھائیں۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ تمام غیر ملکی زبانوں میں انگریزی زبان ہی ہماری رعایا کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے۔

اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ہمیں ایک زبان کی تعلیم دینے کا اختیار حاصل ہے تو کیا پھر بھی ہم اُن زبانوں کی تعلیم دیں گے جن میں مسلّمہ طور پر کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابلِ قدر کتاب نہیں ملتی جسے ہماری زبان کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہو؟ جب ہم یورپین علوم پڑھانے کے معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو کیا پھر بھی ہم اُن علوم کی تعلیم دیں گے جو یورپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں، وہاں اُن کی لغویت مسلّمہ طور پر نمایاں ہے۔

جب ہم ایک صحیح فلسفہ اور تاریخ کی سرپرستی کرنے پر قدرت رکھتے ہیں تو کیا پھر بھی ہم سرکاری دولت کے صرف سے وہ طبی اصول پڑھائیں گے جن کو دیکھ کر انگلستان کا نعلبند بھی خفت محسوس

[1] یہ انگریزی زبان کا وہ اصل استحقاق تھا جس کی بنا پر اسے ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

کرتا ہے[1]۔ وہ علم ہیئت جس پر انگریزی سکولوں کی بچیاں بھی خندہ زن ہونگی[2]۔ وہ علم تاریخ جو

[1] انگلستان کا نعل بند تو ممکن ہے مسکرا دے مگر کوئی ہوشمند اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر گستاولی بان اپنی مشہور تصنیف تمدنِ عرب میں تو عربوں کی برتری کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"عربوں کی طبی ترقیاں، زیادہ تر فن جراحی، علاماتِ امراض، قرابادین اور علم الادویہ میں ہیں۔ انھوں نے علاج کے بہت سے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ مثلاً میعادی بخار (TYPHOID) میں پانی کا استعمال کئی صدیوں تک متروک ہو جانے کے بعد اب دوبارہ جاری ہوا ہے۔ قرابادین میں انہوں نے بہت سی دوائیں بڑھائی ہیں۔ مثلاً خیار شنبر۔ سنا۔ ریوند چینی۔ تمر ہندی کچلہ۔ حب القرمز۔ کافور۔ الکحل وغیرہ اور ادویہ مرکبہ کے وہ گویا موجد ہیں اور اکثر مرکبات جو اس وقت مستعمل ہیں۔ شربت۔ لیپ۔ ضماد۔ دہنیات۔ روغن۔ عرقیات ان ہی سے ہم کو پہنچے . . . ۔ فن جراحی کی بھی ابتدائی ترقی عربوں سے ہوئی اور زمانہ حال تک ان ہی کی تصنیفات پر یورپ کے طبی مدارس کا دارومدار رہا" (ص ۵۵۴)

[2] جس علم ہیئت کی اس قدر تضحیک کی جارہی ہے اُس کے متعلق تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عربوں نے اس میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اس علم میں ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ دسویں صدی سے حسابات میں مماسہ کا استعمال

۲۔ اجرام سماوی کی حرکات کی زیجوں کا مرتب کرنا۔

۳۔ اعوجاج منطقۃ البروج اور اس زاویہ کے تدریج کم ہونے کی نہایت درست تحقیقات۔

۴۔ استعمال معدل النہار کا ٹھیک معلوم کرنا۔

۵۔ سب سے پہلے سال کی درست مدت کا تعین کرنا۔

۶۔ چاند کے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف کرنا۔

۷۔ چاند کے اُس تغیر سے اختلاف کا معلوم کرنا جو آفتاب کے فاصلہ سے پیدا ہوتا ہے اور جسے اختلاف حرکتِ قمر کہتے ہیں اور جس کا انکشاف ۱۶۰۱ء میں ٹیکو براہے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ (تمدنِ عرب)

تیس تیس فٹ لمبے قد کے بادشاہوں کے تذکروں سے بھرا پڑا ہے جنہوں نے تیس تیس ہزار سال تک حکمرانی اور فرمانروائی کی[1] وہ جغرافیہ جو شیرے، راب اور مکھن کے سمندروں کے بیانات پر مشتمل ہے[2]

ہم اس راہ پر بغیر کسی سابقہ تجربے کے نہیں بڑھ رہے۔ تاریخ میں اس سے ملتے جلتے کئی ایک واقعات موجود ہیں اور ان سب سے ایک ہی سبق حاصل ہوتا ہے۔ دور نہ جائیے دورِ جدید میں اُس عظیم تحریک کی وہ قابلِ یادگار مثالیں دیکھیے جس نے پورے سماج کے ذہن کو متحرک کیا، تعصبات کے بندھن توڑے، علم پھیلایا، انسانی ذوق کو پاکیزگی بخشی اور وہ ممالک جن میں جہالت اور زندگی کا دور دورہ تھا اُن میں مختلف علوم و فنون کی آبیاری کی۔

پہلی مثال جس کی طرف میں اس وقت اشارہ کر رہا ہوں وہ احیاء العلوم کی وہ مہتم بالشان تحریک ہے جس نے یورپین اقوام کے اندر پندرہویں صدی کے اختتام اور سولھویں صدی کے آغاز میں جنم لیا[3]۔ اہلِ روما اور اہلِ یونان کی ادبی تخلیقات میں اُس وقت ہر ایسی چیز موجود تھی جسے قابلِ مطالعہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اگر ہمارے آبا و اجداد اُس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے

---

[1] مسلمانوں کا تو کوئی مورخ ایسا نہیں جس نے اس قسم کی تاریخ مرتب کی ہو۔ ابن خلدون کا مقدمہ آج بھی دنیا میں فلسفۂ تاریخ پر آخری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میکالے کو عربی زبان کے تاریخ و جغرافیہ کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ اس نے صرف طلسم ہوش ربا پڑھ کر یہ نوٹ مرتب کر ڈالا۔

[3] یہ تحریک بھی عربوں ہی کی علمی کاوشوں کا صدقہ تھی:

"اسلامی فلسفہ نے نہ صرف یونانی افکار کی تہذیب کی بلکہ انہیں آگے بھی بڑھایا۔ اس نے عیسائی مفکرین کو فلسفہ اور مذہب کے درمیان تطبیق دینا سکھایا لیکن اسلامی فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دورِ متوسط کی تاریکی کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔"

(اسلام اور عرب ۔ روم لانڈو)

جو کہ اب تک مجلسِ تعلیماتِ عامّہ نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر وہ سسرو اور ٹیسی ٹس کی زبان کو نظرانداز کر کے اگر وہ اپنی ساری توجہ صرف اپنی بولی پر ہی مرکوز رکھتے، اگر وہ اینگلو سیکسونی قصے کہانیوں، اور نارمن فرنچ رومانی داستانوں کے علاوہ نہ تو کچھ پڑھاتے اور نہ ہی کچھ شائع کرتے، تو کیا انگلستان اس بلند مقام پر فائز ہو سکتا تھا جس پر وہ اس وقت فائز ہے؟ مور اور اسشام کے معاصرین کی نگاہ میں جو حیثیت یونانی اور لاطینی زبانوں کی تھی وہی حیثیت اہلِ ہند کے نزدیک انگریزی کی ہے۔ انگریزی ادب عہدِ عتیق کے ادب سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے اور مجھے اس امر میں شک ہے کہ سنسکرتی ادب قدر و قیمت کے لحاظ سے ہمارے سیکسینی اور نارمن آبا و اجداد کی ادبی تخلیقات کے ہم پلہ بھی ہو سکتا ہے۔ علم کے بعض شعبوں مثلاً تاریخ میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صورتِ حال اس سے بدرجہا بہتر ہے۔[۱]

ایک دوسری مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ قوم جو ایک سو بیس سال پیشتر وحشت و بہیمیت کی اس منزل میں تھی جس میں کہ صلیبی جنگوں سے قبل ہمارے آبا و اجداد تھے، اس نے آہستہ آہستہ جہالت کے قعرِ عمیق سے نکل کر مہذب اقوام کے درمیان اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ میری مراد روس ہے۔ اب اس ملک میں ایک بہت بڑا تعلیم یافتہ طبقہ معرضِ وجود میں آچکا ہے جو ریاست کے اہم ترین امور کو سر انجام دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ طبقہ کسی لحاظ سے بھی ان اصحابِ کمال سے فروتر نہیں ہے جن سے لندن و پیرس کے نہایت اونچے حلقوں کی تزئین ہوتی ہے۔ یہ

---

[۱] میکالے نے یہاں پھر ایک مغالطہ دیا ہے۔ انگریزوں نے جو کچھ بھی ترقی کی وہ یونانی، لاطینی اور عربی زبانوں سے مدد لے کر ضرور کی، مگر انہوں نے ان کی مدد سے خود اپنی زبان کو مالا مال کیا اور اسے علمی زبان بنایا یہ غلطی انہوں نے ایک دن بھی نہیں کی کہ انگریزی کو چھوڑ کر کسی بیرونی زبان کو اپنی تعلیمی زبان بنا لیتے۔ لیکن میکالے اس مثال کو بنیاد بنا کر اس بات پر استدلال کر رہا ہے کہ ہندوستان میں دیسی زبانوں کو چھوڑ کر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے

عظیم سلطنت جس کی حالت ہمارے جدِ امجد کے عہد میں غالباً پنجاب (یعنی رنجیت سنگھ کے پنجاب) سے بھی بدتر تھی وہ آئندہ دو پشتوں تک ترقی کے میدان میں فرانس اور انگلستان کے ہمرکاب ہوگی۔ آخر یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا۔ نہ تو قومی تعصبات و امتیازات کو ہوا دینے سے، نہ روسی نوجوانوں کے دل و دماغ کو اُن بوڑھی عورتوں کے قصے کہانیاں سنا کر پراگندہ کرنے سے جن پر اُن کے غیر متمدن اور ناتراشیدہ آباؤ اجداد ایمان رکھتے تھے، نہ اُن کے ذہنوں کو سینٹ نکولس کی خرافات کی آماجگاہ بنا کر، نہ انہیں اس "اہم مسئلہ" کے مطالعہ پر متوجہ کر کے کہ یہ دنیا تیرہ ستمبر کو تخلیق ہوئی تھی، نہ اُن لوگوں کو "ملکی علماء" کے اعزاز سے مشرف فرما کر جو ان عجائب و غرائب کا علمی احاطہ کر چکے ہوں — یہ تبدیلی تو اُن غیر ملکی زبانوں کے سکھانے سے معرضِ وجود میں آئی جن میں معلومات کا سب سے زیادہ بیش قیمت خزانہ موجود ہے اور اس طرح علم کے سارے ذخائر تک اُن کی دسترس ہوگئی۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے اہلِ روس کو مہذب اور متمدن بنایا ہے مجھے یقین ہے کہ ان زبانوں نے تاتاریوں کو جو کچھ دیا ہے اُس سے وہ ہندوؤں کو بھی مالا مال کر سکتی ہیں[1]۔

آئیے اب ہم اُن دلائل کا جائزہ لیں جو اس طرزِ عمل کے خلاف جس کی تائید اصول اور تجربہ دونوں کرتے ہیں، بالعموم پیش کیے جاتے ہیں۔ بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اہلِ ملک کا تعاون حاصل کرنا چاہیے اور یہ چیز ہم عربی اور سنسکرت پڑھائے بغیر نہیں کر سکتے۔

میں اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کر سکتا کہ جب ذہنی لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم پر کسی نسبتہً جاہل قوم کے نظامِ تعلیم کی نگرانی کا فرض عائد ہو، تو اس صورتِ حال میں متعلمین سے کہا جائے کہ وہ نصاب طے کریں جسے اساتذۂ کرام انہیں پڑھائیں۔ اس موضوع پر تو کچھ کہنا محض تحصیلِ حاصل ہے کیونکہ

---

[1] یہ پھر وہی مغالطہ ہے۔ کیا روسیوں نے اپنی زبان چھوڑ کر کسی مغربی زبان کو اپنے ہاں ذریعہ تعلیم بنالیا تھا اور یہی ان کی ترقی کا ذریعہ بنا؟ یا دراصل انہوں نے ساری ترقی اس بنا پر کی کہ دوسری زبانوں کے علوم لے کر اپنی زبان کو مالا مال کیا۔ دراصل میکالے صاحب نے وہ نسخہ ہمارے لیے تجویز کیا تھا جو کسی قوم کی ترقی کا نہیں بلکہ اسے ایسا غلام بنانے کا نسخہ تھا کہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہی بنی رہے۔

یہ امر ناقابلِ تردید شواہد سے ثابت ہے کہ ہمیں اس وقت اہلِ ملک کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ مگر یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اہلِ ملک کی علمی و عقلی صحت کو نظر انداز کر کے ان کے ذوق کا پاس کرنے لگیں[1]۔ اور یہاں تو ہم ان کے ذوق کا پاس بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انہیں اُس تعلیم سے محروم کر رہے ہیں جسے حاصل کرنے کے وہ شدید طور پر آرزومند ہیں اور اُن پر وہ مضحکہ خیز نظامِ تعلیم مسلط کر رہے ہیں جس سے انہیں گھن آتی ہے۔

یہ بات اس امرِ واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے والے طلبا کو تو معاوضہ دینا پڑتا ہے مگر ان کے برعکس وہ لوگ۔ جو انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ فیس دینے پر بالکل آمادہ ہیں۔ اگر دنیا کی ساری طلاقتِ لسانی بھی محبت اور احترام کے اُن جذبات کے حق میں صرف کر دی جائے جو اس ملک کے لوگ اپنی مادری زبانوں کے لیے اپنے سینوں میں رکھتے ہیں تب بھی کوئی غیر جانبدار انسان اس بدیہی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ہمیں اپنی اس عظیم قلمرو کے اندر ایک طالب علم بھی ایسا نہیں ملا جسے وظیفہ دیئے بغیر ان زبانوں کے پڑھنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہو[2]۔

[1] علمی و عقلی صحت سے مراد غالباً محض کلرک بن سکنا ہے۔

[2] یہ عجیب بات ہے کہ پہلے تو ان لوگوں نے مشرقی علوم اور زبانیں پڑھنے والوں کے لیے رزق کے تمام دروازے بند کر کے صرف ان طالب علموں کے لیے روٹی اور عزت کے مواقع مخصوص کر دیئے جو انگریزی پڑھیں۔ پھر جب حال یہ ہو گیا کہ لوگ پیسے دے کر انگریزی پڑھنے لگے اور وظیفہ لیے بغیر مشرقی علوم پڑھنے سے جی چرانے لگے تو اسے اس امر کی دلیل بنا لیا گیا کہ ہندوستان کے باشندوں کو تو اپنی زبانوں سے گھن آتی ہے اور وہ اپنے لیے انگریزی ہی پسند کرتے ہیں۔ تاہم واقعات تمام تر لارڈ میکالے کا ساتھ نہیں دیتے اس وقت ہمارے پیشِ نظر گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ ہے جسے گیرٹ صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کالج کے آغاز سے تیس برس تک گورنمنٹ کالج کے جتنے پرنسپل آئے وہ سب یہی رونا روتے رہے کہ وظائف کے بغیر لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ نہیں۔ چنانچہ نہ صرف طلباء کو وظائف دیئے گئے بلکہ تعلیم سے فارغ ہو چکنے کے بعد ان کے لیے ملازمتوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ یہ اُس دور کے حالات ہیں جبکہ سرسید کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔

میرے سامنے اس وقت کلکتہ مدرسہ کے ایک مہینے یعنی دسمبر ۱۸۳۳ء کے حسابات ہیں عربی پڑھنے والے طلبا کی تعداد ۷۷ ہے اور ان سب کو مجموعی طور پر ہر مہینے پانچ سو روپے سے زائد وظائف دیئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سامنے حساب کی یہ مد بھی موجود ہے: انگریزی پڑھنے والے طلبا سے گذشتہ ماہ مئی، جون اور جولائی میں وصول شدہ رقم ۱۰۳ روپیہ مذکورہ بالا اخراجات میں سے منہا کیے گئے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس صورتِ حال پر میرا استعجاب یہاں کے مقامی حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ذاتی اخراجات سے تعلیم حاصل کرنے کا رواج قریب قریب ناپید ہے۔ لیکن یہ چیز تو میری رائے کو اور زیادہ تقویت بخشتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کہیں بھی لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے کچھ دینا نہیں پڑتا جنہیں وہ خود اپنے لیے خوش آئند یا نفع آور خیال کرتے ہوں۔ ہندوستان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ ہندوستانی جب بھوک محسوس ہونے پر چاول کھاتے ہیں تو انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا، انہیں موسم سرما میں گرم کپڑے پہننے کے لیے بھی کوئی وظیفہ دے کر آمادہ نہیں کیا جاتا۔ جو صورتِ حال اس وقت ہمیں درپیش ہے اُس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ دیکھیے کہ وہ بچے جو دیہی مدارس میں ابتدائی حساب اور کتابیں پڑھتے ہیں انہیں استاد کوئی مادی صلہ نہیں دیتا بلکہ مدرس کو اس کی محنت کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ پھر آخر اُن لوگوں کو کیوں محنتانہ دیا جائے جو سنسکرت اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے اور اسے ہر شخص بڑی شدت کے ساتھ محسوس بھی کرتا ہے کہ سنسکرت اور عربی وہ ایسی زبانیں ہیں جن کے اکتساب سے اُس مشقت کی تلافی نہیں ہوتی جو انہیں سیکھنے کے لیے اٹھانی پڑتی ہے[1]۔ یہاں اصل اور فیصلہ کن چیز صرف منڈی[2] ہے۔

[1] انگریز کی یہاں تشریف آوری کے بعد ملک کے اندر اس قسم کی فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی جس میں یہ مشرقی علوم خود بخود دم توڑ دیں۔ اس بدلے ہوئے ماحول میں اگر یہ علوم ختم نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔ اسے تو محض ایک معجزہ سمجھیے کہ ان علوم کے لیے اس قدر ناسازگار حالات پیدا کرنے کے باوجود یہ آج تک زندہ چلے آرہے ہیں۔

[2] یہ ہے کانٹے کی بات۔ پہلے ایک قوم کو بھوکا مارو یہاں تک کہ اس کے لیے سب کچھ منڈی میں فروخت ہو۔

اگر اس ضمن میں مزید شواہد درکار ہوں تو اُن کی بھی کوئی کمی نہیں۔ سنسکرت کالج کے قدیم طلبا نے گزشتہ سال کمیٹی کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ کالج میں دس بارہ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور انہوں نے ہندو ادب اور علوم سے اچھی خاصی واقفیت پیدا کر لی ہے اور اسی سلسلہ میں انہیں اسنادِ فضیلت بھی مل چکی ہیں۔ لیکن اس کا ثمرہ انہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ ان اسناد کے باوجود ابنائے وطن اُن سے بالکل بے توجہی برتتے ہیں۔ اپنے اہلِ ملک سے انہیں کسی مدد یا حوصلہ افزائی کی امید نظر نہیں آتی۔ اب اگر معزز کمیٹی ان کی دستگیری نہ کرے تو وہ اصلاحِ احوال کے کوئی امکانات نہیں دیکھتے۔ لہٰذا وہ ملتجی ہیں کہ حکومت کے تحت انہیں ایسے مناصب دینے کی حضور گورنر جنرل کی خدمت میں سفارش کی جائے جو اگرچہ بہت اونچے نہ سہی مگر انہیں زندہ رہنے کے قابل تو بنا دیں۔ انہیں بہتر رہائش اور ترقی کے لیے ذرائع کار درکار ہیں جنہیں وہ اس حکومت کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے جو بچپن سے ہی ان کی تعلیم کی کفیل رہی ہے۔ ان طلبا نے اپنی عرضداشت کو اس رقت انگیز التجا پر ختم کیا ہے کہ انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ حکومت جس نے دورانِ تعلیم میں اُن کے ساتھ انتہائی فیاضی کا سلوک کیا ہے اُس کی کبھی یہ نیت نہ تھی کہ تعلیم کے بعد انہیں بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔

معاوضوں کے لیے حکومت کے سامنے جو عرضداشتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر میری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ ساری عرضداشتیں حتیٰ کہ سب سے زیادہ نامعقول درخواستیں بھی اس بنیاد پر مبنی ہیں کہ ان حضرات کا کوئی بہت زیادہ نقصان ہوا ہے یا ان کے ساتھ کوئی بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ یقیناً یہ پہلے داد خواہ ہیں جنہوں نے مفت تعلیم حاصل کرنے کا معاوضہ طلب کیا ہے۔

ہو سکنے والا مال بن جائے۔ پھر اس کے اپنے علوم کے لیے مارکیٹ میں مکمل کساد بازاری پیدا کر دو اور فاتح قوم کے علوم حاصل کرنے والوں کو اچھے داموں خریدنا شروع کر دو۔ اس کے بعد جب ان علوم کا بھاؤ آپ سے آپ چڑھ جائے تو اسے اس بات کی دلیل بناؤ کہ دیسی زبانیں اور ان کے علوم تو ہیں ہی ناکارہ ورنہ بازار میں ان کی قیمت اس قدر کیوں گر جاتی؟

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دس بارہ سال ملکی خزانے سے امداد ملتی رہی اور پھر انہیں ادب اور علوم سے خوب بھرپور کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا۔ اب یہ اپنی اس تعلیم کو اپنے حق میں ایک ایسی زیادتی سے تعبیر کرتے ہیں جس کی حکومت کو تلافی کرنی چاہیے۔ ایک ایسی چوٹ جس کی تکلیف کے مقابلے میں وہ مالی امداد انہیں کم نظر آتی ہے جو انہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ میں ان لوگوں کو یقیناً برحق سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصّہ ایک ایسی چیز کو سیکھنے میں کھپایا ہے جس کے ذریعہ نہ تو وہ روٹی کما سکتے ہیں نہ انہیں معاشرہ میں عزت و احترام ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس رقم کو جسے ان لوگوں کو نکما اور بیکار بنانے پر صرف کیا گیا ہے کسی بہتر مصرف کے لیے بچا سکتے تھے۔ ریاست بہت کم خرچ کر کے بھی انہیں بڑی آسانی کے ساتھ اہلِ ملک کے لیے ایک بوجھ اور تذلیل و تحقیر کا ہدف بنانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ مگر ہم نے اس پالیسی کو اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم نے حق اور باطل کی کشمکش میں غیر متعلق تماشائی بن کر رہنا بھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ ہم اس بات پر بھی قانع نہ ہوئے کہ اہلِ ملک کو اپنے آبائی تعصبات کا اثر قبول کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے۔ ہم نے خود آگے بڑھ کر اُن قدرتی موانع کے ساتھ جو مشرق میں حقیقی علمی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اپنی طرف سے بہت سی مشکلات کا اضافہ کر لیا۔ وہ مراعات و وظائف جنہیں شاید ہم حق و صداقت[۱] کی نشر و اشاعت پر بھی خرچ کرنا مناسب نہ سمجھیں۔ انہیں غلط ذوق اور باطل فلسفہ کے پھیلانے پر ہم بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔

ہمارے اس طرزِ عمل سے وہ برائی پروان چڑھ رہی ہے جس سے ہمیں خدشہ لاحق ہے

ہم اُس مخالفت کو جنم دے رہے ہیں جو فی الحال ناپید ہے۔ عربی اور سنسکرت کالجوں پر اس وقت جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ نہ صرف صداقت کی حق تلفی ہے بلکہ سرکاری خزانے سے غلط کاروں کی پرورش کی جا رہی ہے۔ اس رقم سے ایسی پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی ہیں جن میں نہ صرف

---

[۱] سوال یہ ہے کہ اس قسم کے حوصلہ شکن حالات آخر پیدا کس نے کیے۔ یہ تو صرف سرکار انگریزی کی کرم فرمائی تھی کہ اس ملک کے لوگ اپنے علوم پڑھ کر اس درجہ خوار ہونے لگے۔

مجبور و بے بس بے روزگار پناہ لیتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایسے متعصب اور تنگ نظر لوگوں کو بھی پرورش کیا جا رہا ہے۔ جو اپنے تعصبات اور مفادات کی بنا پر ہر نئی تعلیمی سکیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں[1]۔ اگر ہندوستان میں اُس تبدیلی کے خلاف جس کی میں اس وقت وکالت کر رہا ہوں، کچھ بھی جذبہ موجود ہے تو یہ ہمارے اپنے نظام کا نتیجہ ہے۔ اس مخالفت کے قائدین وہی لوگ ہونگے جو ہمارے وظائف پر پلے ہیں اور ہمارے اپنے کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم اپنی موجودہ روش پر جتنے لمبے عرصے تک گامزن رہیں گے، اتنی ہی مخالفت تیز تر ہوتی چلی جائے گی اور اس تحریک کو ہر سال ہم اپنی جیب سے خرچ کر کے ایسے تازہ دم مردان کار مہیا کریں گے جو اس کی تقویت کا باعث ہونگے۔ اگر اہلِ ملک کو صرف اپنے حال پر ہی چھوڑ دیا جائے تو ہمیں کسی قسم کی مشکلات کا اندیشہ نہیں۔ ساری بک بک اسی مشرقی مفاد کی طرف سے ہوگی جسے ہم نے بالکل مصنوعی طریقوں سے پیدا کر کے قوت و توانائی بخشی ہے۔

ایک اور امر بھی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اگر رائے عامہ سے تعرض نہ کیا جائے تو وہ فی الواقع اُس انداز سے مختلف ہوگی جس انداز سے کہ قدیم نظامِ تعلیم کے حامی اُسے پیش کرتے ہیں۔ کمیٹی نے عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک لاکھ کی رقم وقف کی مگر ان کتابوں کی اب کوئی نکاسی نہیں۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ کتاب فروخت ہو جاتی ہے۔ تئیس ہزار نسخے جن میں بیشتر کی ابھی تک جزو بندی بھی نہیں ہوئی، مختلف لائبریریوں یا کمیٹی کے گودام میں بکھرے پڑے ہیں۔ کمیٹی نے مشرقی ادب کے اس وسیع ذخیرے کے ایک حصے سے خلاصی پانے کے لیے کتابوں کی مفت تقسیم شروع کی مگر وہ جس رفتار سے شائع ہو رہی ہیں اُس رفتار سے تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔ سال بھر میں بیس ہزار روپے کی رقم ان ردی کاغذوں میں اضافہ پر صرف کی جا رہی ہے جن کا سٹاک ہمارے پاس کافی مقدار میں پہلے سے موجود ہے۔ گزشتہ تین سالوں میں اس

[1] یہ ہے اصل خطرہ جو کھٹک رہا ہے۔

طرح تقریباً ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔ لیکن اسی عرصہ میں عربی اور سنسکرت کتابوں کی فروخت سے جو آمدنی ہوئی ہے وہ بصد مشکل ایک ہزار روپیہ تک پہنچتی ہے[1]۔ اس کے برعکس اسی اثنا میں سکول بک سوسائٹی نے انگریزی کتابوں کی سات یا آٹھ ہزار جلدیں سالانہ فروخت کی ہیں۔ فروخت کے ان حاصلات سے نہ صرف اشاعت کے اخراجات پورے ہو رہے ہیں بلکہ سرمایہ پر بیس فیصد نفع بھی مل رہا ہے۔

اس بات پر بہت اصرار کیا گیا ہے کہ ہندو قانون تو سنسکرت کی کتابوں سے اور محمڈن لا عربی کتابوں ہی سے اخذ کرنا ہوگا لیکن یہ معاملہ مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں ڈالتا ہمیں پارلیمنٹ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے لیے قوانین مرتب کریں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لاکمیشن کی امداد بھی بہم پہنچائی گئی ہے۔ جس وقت نیا ضابطۂ قانون نافذ ہوگا اسی وقت منصفوں اور صدر امینوں کے لیے شاستر اور ہدایہ بالکل بیکار ہو جائیں گی۔ مجھے امید واثق ہے کہ وہ طلبا جنہوں نے اب عربی مدارس اور سنسکرت کالجوں میں داخلہ لیا ہے، اُن کے تعلیم سے فارغ ہونے سے پیشتر، یہ عظیم کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہوگا۔ ہمارا یہ فعل بدیہی طور پر احمقانہ ہوگا کہ ہم نئی نسل کو اُن حالات کے پیش نظر تعلیم دیں جنہیں اُن کے جوان ہونے سے پہلے ہم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں[2]۔

---

[1] ان کتب کی نشر و اشاعت کا معاملہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہے۔ سنسکرت کی کتابوں کے بارے میں ہم کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن فارسی اور عربی کی کتب کے متعلق یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا انتخاب انتہائی ناقص تھا۔ اس وجہ سے ان کا صحیح طور پر نکاس نہ ہوسکا۔

[2] لارڈ میکالے کا طرزِ استدلال ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ ملک کے سارے حالات، خواہ اُن کا تعلق سیاست سے ہو یا قانون یا معیشت یا معاشرت سے، بدل دینے کا تہیہ کر چکے ہیں اور دوسری طرف وہ اہلِ ملک کے متعلق یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو پرانے نظامِ تعلیم سے کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہیں۔ جن لوگوں کو اپنی علمی احیا سے صحیح معنوں میں دلبستگی رہی وہ تو آخر دم تک اسی نظامِ تعلیم کے حامی رہے جو انہیں اپنے اسلاف سے ملا تھا۔ باقی رہے وہ حضرات

عربی اور سنسکرت کے حق میں ایک اور دلیل جو اس سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور بودی ہے، یہ دی جاتی ہے کہ ان زبانوں میں چونکہ کروڑوں انسانوں کی مقدس کتابیں موجود ہیں اس بنا پر یہ خصوصی امداد کی مستحق ہیں۔ سرکار انگریزی کا بلاشبہ یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے مذہبی معاملات میں نہ صرف روادار ہو بلکہ غیر جانبدار بھی ہو۔ مگر کسی ایسے ادب کی (جو مسلمہ طور پر بہت کم قدر و قیمت کا حامل ہے) محض اس وجہ سے حوصلہ افزائی کرتے چلے جانا کہ اس میں بعض اہم موضوعات پر انتہائی غلط باتیں موجود ہیں میرے نزدیک ایک ایسی روش ہے جس کی تائید نہ تو عقل کرتی ہے نہ اخلاق۔ اور نہ وہ غیر جانبداری جس کا قائم رکھنا ہم سب کا ایک مقدس فرض ہے۔ ایک ایسی زبان جس کے بارے میں ہر شخص (یعنی ہر انگریز) تسلیم کرتا ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کی مفید معلومات سے خالی ہے، کیا اُس کے پڑھانے کا اس لیے التزام کیا جائے کیونکہ یہ ہیئت ناک اوہام کو جنم دیتی ہے؟ کیا ہم جھوٹی تاریخ، غلط علم ہیئت اور غلط تاریخ محض اس لیے پڑھائیں کہ ان سے ایک باطل مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ ہم اس بات سے بہت زیادہ احتراز کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ اُن مسیحی مشنریوں کی سرکاری طور پر پشت پناہی کی جائے جو اہل ملک کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں[1]۔ جب عیسائیت کے بارے میں ہمارا طرز عمل یہ ہے تو کیا مناسب ہوگا کہ ہم حکومت کے خزانے سے رشوت دیکر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی نئی نسل کو اس قسم کی تعلیم دلوائے جس کے ذریعہ انسان یہ جان سکے کہ گدھے کو چھونے کے بعد آدمی کس طرح پاک ہو سکتا ہے یا وید کے کن اشلوکوں سے بکرا مار دینے کا کفارہ ادا کیا جاسکتا ہے۔

مشرقی علوم کے حامی اس بات کو ایک تسلیم شدہ حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس ملک کا کوئی

۱۔ جو بر چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کرنے والے تھے اور جن کی پیشانی ابھرتے ہوئے اقتدار کے سامنے فوراً جھک جاتی تھی۔ جن کی نگاہ پیٹ اور جیب سے آگے نہیں گزرتی تھی وہ اگر بدلے ہوئے حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے نئے نظام تعلیم کو خوش آمدید کہنے لگے تو اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔

باشندہ انگریزی زبان کی بالکل ابتدائی واقفیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا[1]۔ وہ اسے ثابت تو نہیں کر پاتے مگر اس پر ہمیشہ اصرار ضرور کرتے ہیں۔ یہ حضرات محض تحقیر کے طور پر انگریزی تعلیم کو محض ہجے سکھانے کی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ نہایت اونچے درجے کے ہندی اور عربی علم و ادب اور انگریزی مبادیات کی سطحی معلومات کے مابین انتخاب ہے۔ یہ نہ صرف ایک مفروضہ ہے بلکہ ایک ایسا مفروضہ جس کی عقل اور تجربہ دونوں تائید نہیں کرتے۔ ہم اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ ساری قوموں کے لوگ ہماری زبان سے اس حد تک واقف ہیں جس سے وہ بآسانی اُن دقیق اور پیچیدہ مسائل کو سمجھ سکتے ہیں جن سے اس زبان کا دامن بھرپور ہے اور اس کے ذریعہ وہ اُن ادبی لطافتوں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے اعلیٰ انشا پردازوں کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اسی شہر (کلکتہ) میں بہت سے ایسے ہندوستانی موجود ہیں جو انگریزی زبان میں بڑی سلاست اور جامعیت کے ساتھ سیاسی اور علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ میں نے اسی مسئلہ پر جس کے متعلق میں اس وقت تحریر کر رہا ہوں بعض ہندوستانی شرفاء کو اس کشادہ دلی اور فہم و فراست کے ساتھ بحث کرتے ہوئے دیکھا ہے جو مجلس تعلیماتِ عامہ کے ارکان کے لیے بھی عزت و افتخار کا باعث ہو سکتی ہے۔ براعظم یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیر ملکی شاید خال خال ہی ملیں جو اتنی رواں اور صحیح انگریزی بول سکیں جتنی کہ بعض ہندو بولنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس امر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ انگریزی ایک ہندو کے لیے اتنی مشکل نہیں جتنی کہ یونانی ایک انگریز کے لیے ہو سکتی ہے۔ جتنے عرصے میں ہمارے بدنصیب طلبا سنسکرت کالج سے فارغ ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کم مدت میں ایک ذہین انگریز نوجوان یونانی مصنفین کی تحریروں کو پڑھنے، ان سے لطف اندوز ہونے اور ان کا تتبع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز نوجوان جتنا

[1] گزشتہ دو سو سال کے واقعات نے تو ان حضرات کے اس دعویٰ کو بالکل صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آخر ہم نے اتنی محنت و مشقت کے بعد انگریزی میں کتنے شیکسپیئر، کتنے ملٹن اور کتنے کارلائل اور رسکن پیدا کیے ہیں؟ دوسری طرف دیکھ لیجیے کہ غلامی اور انحطاط کے باوجود اسی مدت کے اندر ہمارے ہاں اپنی زبان کے کیسے کیسے نامور ادیب پیدا ہوئے۔

وقت ہیروڈوٹس اور سفوکلیز کو سمجھنے کے لیے لیتا ہے اس سے کم مدت میں ایک ہندو کو ہیوم اور ملٹن سمجھ لینا چاہیے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ ہم پارلیمنٹ کے ۱۸۱۳ء کے قانون کے کسی طرح بھی پابند نہیں۔ ہم کسی ایسے معاہدے کی جکڑبندیوں میں بھی گرفتار نہیں جو ہم نے صراحتاً یا کنایۃً کیا ہو۔ ہم اپنے فنڈ کے استعمال میں یکسر آزاد اور خود مختار ہیں۔ ہمیں اس رقم کو اس تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے جو موزوں ہے اور اس نقطۂ نظر سے انگریزی زبان سنسکرت اور عربی کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے۔ اس ملک کے رہنے والے عربی اور سنسکرت پڑھنے کے قطعاً خواہشمند نہیں بلکہ انگریزی سیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں قانونی ضرورت کے تحت بھی اور مذہبی ضرورت کے پیش نظر بھی کسی خصوصی امداد کی مستحق نہیں ٹھہرائی جا سکتیں۔ اس ملک کے باشندوں میں ہم انگریزی کے بہت اچھے فاضل پیدا کر سکتے ہیں اور اسی مقصد پر ہماری ساری کوششیں مرکوز ہونی چاہییں

میں ان حضرات سے جن کی میں نے مخالفت کی ہے ایک معاملہ میں پوری طرح متفق ہوں۔ میرا ذاتی تاثر بھی ان کے احساس کی طرح یہی ہے کہ ہم فی الحال اپنے محدود ذرائع کے ساتھ سب لوگوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمراں ہیں ـــ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز۔ پھر اس کام کی ذمہ داری اس طبقے پر چھوڑ دیں کہ وہ اس ملک کی بولیوں کو سنوارے، مغربی علوم سے سائنسی اصطلاحات لیکر ان زبانوں کو مالا مال کرے اور آہستہ آہستہ انہیں اس قابل بنا دے کہ ان کے ذریعہ ملک کی عام آبادی کو تعلیم دی جا سکے۔

اس وقت جو مفادات موجود ہیں مجھے ان کا پورا پورا احترام ہے۔ میں ان سارے افراد سے فیاضانہ سلوک اور برتاؤ کرنے کے لیے تیار ہوں جو جائز طور پر مالی امداد کے حقدار ہیں۔ لیکن میں اس غلط نظامِ تعلیم کو، جس کی ابھی تک ہم آبیاری کرتے چلے آرہے ہیں، بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتا

ہوں۔ میں فی الفور عربی اور سنسکرت کتب کی طباعت روکنے اور مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج کو منتقل کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بنارس برہمنی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے اور دہلی عربی کا۔ اگر ہم صرف بنارس میں سنسکرت کالج اور دہلی میں عربی کالج قائم رکھیں تو میرے نزدیک مشرقی زبانوں کے حق میں یہی چیز کافی، بلکہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر بنارس اور دہلی کے کالجوں کو قائم رکھنا ہو تو میں کم از کم اس بات کی سفارش ضرور کروں گا کہ جو طلبہ ان کی طرف رجوع کرنے میں انہیں قطعاً کوئی وظیفہ نہ دیا جائے۔ بلکہ لوگ دو متقابل نظامہائے تعلیم کے درمیان انتخاب کرنے میں بالکل آزاد ہوں اور انہیں قطعی طور پر کسی ناجائز ترغیب سے ایسی تعلیم کے حصول پر آمادہ نہ کیا جائے جس کے لیے وہ خود تیار نہیں ہیں۔ اس طرح وہ فنڈ جو ہمارے ہاتھ آئیں گے ان سے ہم کلکتہ کے ہندو کالج کو (جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی) نسبتاً زیادہ مالی امداد بہم پہنچا سکیں گے اور اس قابل ہونگے کہ فورٹ ولیم اور آگرہ پریذیڈنسی کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے سکول قائم کریں جن میں انگریزی زبان اچھی طرح پڑھائی جا سکتی ہو۔

اگر ہز لارڈشپ باجلاس کونسل کا فیصلہ یہی ہو، اور جیسا کہ میں امید کرتا ہوں، یہی ہو گا، تو پھر میں اپنے فرائض کو پورے جذبہ اور مستعدی سے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اگر بالفرض حکومت موجودہ نظام کو جوں کا توں قائم رکھنے کا ارادہ رکھتی ہو تو پھر میری درخواست یہ ہے کہ مجھے اس کمیٹی کی صدارت سے سبکدوش ہونے کی اجازت دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں میرا وجود کسی افادیت کا حامل نہیں۔ پھر مجھے اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ اس صورتِ حال میں ایک ایسے نظام کی حمایت کرنے کا ارتکاب کرونگا جسے میں ایمانداری سے اپنی دانست میں محض ایک فریب نظر سمجھتا ہوں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ موجودہ نظام سے حق وصداقت کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ اس سے دم توڑتی ہوئی غلط کاریوں کی طبعی موت میں کچھ تعویق ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک ہم اس بات کے قطعاً مستحق نہیں کہ ہمیں مجلس تعلیمات عامہ کے معزز امتیاز سے مشرف کیا جائے۔ ہم تو ایک ایسی منڈلی ہیں جو روپیہ کا زیاں کر رہی ہے، ایسی کتابیں شائع کر رہی ہے

جن کے چھپنے سے کاغذ کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی ان کے چھپنے سے پہلے ہوتی ہے، لغو تاریخ لغو الٰہیات، لغو طبعیات، اور لغو دینیات کو بالکل مصنوعی طریق سے فروغ دے رہی ہے۔ اہلِ علم کا ایک ایسا گروہ تیار کر رہی ہے جو اس علم کو اپنے حق میں ایک مصیبت اور عار سمجھتا ہے۔ جو دورانِ تعلیم عوام کی امداد پر بسر اوقات کرتا ہے اور جس کی تعلیم اتنی بیکار اور غیر مفید ہے کہ اسے حاصل کر لینے کے بعد بھی یا تو وہ فاقہ مستی کا شکار ہوتا ہے یا زندگی کے باقی ایام لوگوں کی خیرات پر گذارتا ہے۔ ان احساسات و نظریات کے ساتھ میں طبعاً اُس مجلس کی ذمہ داری میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا جس کے انداز اور طرزِ عمل کو اگر بدلا نہ گیا تو وہ میرے نزدیک نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ لازمی طور پر نقصان دہ اور مضرت رساں بھی ہے۔

(بقیہ اشارات)

اس مقصد کی تکمیل کے لیے جگہ جگہ سکول اور کالج کھولے گئے۔ پنجاب اور یو۔پی میں بیسیوں ایسے مراکز قائم ہو گئے جن سے مشن کے لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی۔ سیرام پور مشن کا پہلا ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" انہیں مقاصد کا آئینہ دار تھا۔

ان عیسائی مشنوں کو "عیسائیت" پھیلانے میں تو کوئی قابلِ لحاظ کامیابی نہ ہوئی، البتہ انہیں اس باب میں یقینی کامیابی حاصل ہو گئی کہ لوگوں کے سامنے جب مذہب کا نام لیا جائے تو ذہن ایک ایسے نظریے کی طرف منتقل ہو جائے جس میں عقل کا کوئی دخل نہ ہو، وہ سر تا پا توہم پرستی، بے دلیل عقیدت، اندھے یقین، اور جاہلانہ تعصبات کا مجموعہ ہو اور عملی زندگی میں انسان کی قطعاً کوئی رہنمائی نہ کر سکے بلکہ اس کی ترقی کی راہ میں روک کا کام دے اور اس طرح ذہین و فطین لوگوں کی نظر میں یہ خود بخود ایک اضحوکہ بن جائے اور وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔

یہ ہیں مختصر طور پر وہ تدابیر جن سے مسلمانوں کی متاعِ ایمان کی قیمت گرانے میں کام لیا گیا۔ اس پروگرام کا تیسرا جزو نظامِ تعلیم ہے جس پر انشاء اللہ آئندہ شمارے میں بحث کریں گے۔ (باقی)

خالی صفحه

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ھیں جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے ۔

* ــپہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے

* ــدوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے ۔

اول الذکر مسئلے کے بارے میں انسانی ذھن نے آج تک کیا حل تجویز کئے ھیں ؟

* ــقدیم یونان، روم اور مسیحی یورپ کے تمدنی نظریات نے اس کا کیا جواب دیا ؟ اور اس کے کیا عملی نتائج برآمد ھوئے ؟

* ــجدید مسیحی یورپ اور مغربی اقوام اس بارے میں کیا کیا ٹھوکریں کھا رھی ھیں ۔ اور کس قدر خطرناک عواقب سے دو چار ھیں ؟

اس کے برعکس ۔

* ــاسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے ۔ اور انسانی نظام اجتماع کے لئے کیا اصول و نظریات قائم کئے ھیں ؟

* ــعورت کے لئے پردے کو کیوں لازم قرار دیا ؟

* ــاسلامی پردے کی نوعیت اور حدود کیا ھیں ؟

آپ کو ان تمام سوالات کا جواب

سید ابو الاعلی مودودی

کی معرکۃ الآرا تصنیف **پردہ** میں تفصیل سے ملے گا ۔